

کتاب

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آسنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ محصول ہونے پر۔
منجر "نگار"

نگارستان

تصانیف نیاز فوری

نگارستان

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان، اسکی تخیل، اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت ایک روپیہ (عمر)

علاوہ محصول

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔

قیمت دو روپیہ (عمر)

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز

ادیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیل پرین کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی جہز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔
تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عمر)

علاوہ محصول

جمالستان

ادیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے ۳۳۵ تک کے درج ہیں۔ قدرت بیان، اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (لحد)

علاوہ محصول

آئندہ جنوری ۱۹۲۲ء کے متعلق صفحہ ۸ کا اشتہار ملاحظہ فرمائیے

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر و جب اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

صفحہ	فہرست مضامین نمبر ۱۹۱۹ء	جلد
۲	ملاحظات	
۹	محمد عتیق صدیقی	ہندوستانی صحافت بیسویں صدی میں
۲۰	سید علی سجاد قہر الہ آبادی - بی۔ اے۔	نگار بازگشت
۳۴	شکر سروپ بھٹناگر - ام۔ اے۔	پردہ
۳۸	نظیر حیدر	غلط فہمی
۴۱		اکبر الہ آبادی
۴۷		مکتوبات نیاز
۵۱		مراسلات
۵۳		مطبوعات موصولہ
۵۹		وقت کی باتیں
۶۲		انتخاب کلام میر

نگار

ادیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴	نومبر ۴	شمارہ
-------	---------	-------

ملاحظات

جنگ اور ہندوستان

لڑائی کی وہ آگ جس کے شعلے یورپ کے مغربی سواحل تک پہنچ کر دو بار انگلستان کے سامنے ٹھنڈے سے پڑ گئے تھے، ۲۲ جولائی سے مشرقی یورپ کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس کی رفتار تیز ہو رہی ہے، لیکن خطرناک ضرور ہے اور ہر دن ہمارے اندیشوں میں ایک نیا اضافہ لیکر طلوع ہوتا ہے

جرمنی کو اس وقت تک روس کے محاذ پر جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ عارضی ہو یا مستقل، لیکن ہے بہر حال کامیابی اور ہم صرف اپنی تمناؤں یا دعاؤں کے اعتماد پر اس کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے

یقیناً جرمنی کو اس کی توقع کے خلاف، اس محاذ پر بہت زیادہ وقت صرف کرنا پڑا، بڑی زبردست قربانیاں پیش کرنا پڑیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ روس جس پامردی کے ساتھ تاسیوں کے اس سیلاب آتش و آہن کا مقابلہ کر رہا ہے وہ تاریخ کا بالکل پہلا واقعہ ہے، لیکن ان باتوں سے تسکین ڈھونڈنا یا دوسروں کے اضطراب میں کمی پیدا کرنے کی کوشش کرنا بالکل لایعنی بات ہے مظلوم کی اخلاقی قوتیں کبھی ایک ظالم کی کھچی ہوئی تلوار کے سامنے ڈھال نہیں بن سکیں اور قدرت کا یہ کوئی مسلمہ اصول نہیں ہے کہ وہ سرکش کو اس کی سرکشی کی سزا ضرور دے۔ قوموں کا بننا بگڑنا آج تک صرف قوت و ضعف پر منحصر رہا ہے۔ قوت و ضعف اخلاق کا نہیں، بلکہ وحشت و بربریت کا، مادی ذریعہ کا۔ اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ جرمن قوم نے آج اپنی اس قوت کا سکہ بٹھا رکھا ہے

ہو سکتا ہے کہ عاد و ثمود کی قوموں کو تباہ کر دینے والا خدا، کسی وقت ناسی قوم کو بھی فنا کر دے، لیکن اگر کبھی ایسا ہوا، تو یہ اس طرح نہ ہوگا کہ زلزلہ آیا اور جرمنی کا تختہ الٹ گیا، یا جرمن افراد کی صورتیں مسخ ہو کر وہ انسان سے جانور بن گئے، بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہوگی کہ کوئی دوسری قوم اُس سے زیادہ مضبوط عزم و ارادہ، اس سے زیادہ خوفناک قوت اور اُس سے زیادہ ہلاکت بار آلات لیکر اُٹھی اور دنیا کا وہ نقشہ جسے جرمن تلوار نے قائم کیا تھا، اس کو دوسری قوم کی تیز تر تلوار نے مٹا کر رکھ دیا۔ یہ ہے قدرت کا قانون اور یہی ہے فطرت کی سنت جاریہ۔۔۔ محض دُعاؤں سے اس وقت تک نہ کوئی ملک فتح ہوا، نہ مغلوب ہونے سے بچا رہا۔ اس لئے اگر "ناسیت" واقعی کوئی فتنہ ہے۔ اور اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔۔۔ تو ہم کو صرف اس توقع پر مطمئن نہ ہونا چاہئے کہ روس کی زبردست مدافعت، کاکیشیا کا کوہستان اور ماسکو کی برفباریاں، اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے کافی ہیں، یا یہ کہ برطانیہ و امریکہ کی جمہوریتیں اس کو فنا کر کے رکھ دیں گی، بلکہ اپنی اجتماعی وحدت پر بھروسہ کر کے اس کے مقابلہ کی تیاریاں کرنا چاہئے۔ اس وقت سوال نہ برطانیہ کا ہے، نہ امریکہ کا، نہ مغربی جمہوریت کا نہ روسی اشتراکیت کا۔ بلکہ صرف اس غور و تامل کا کہ اگر یہ آگ بڑھتے بڑھتے ہندوستان تک پہنچی تو کیا ہم صرف آلہ کار کی حیثیت سے اپنے وطن کی مدافعت کریں گے؟۔۔۔ اگر ہماری ہمتوں کا تقاضہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تو شاید "برطانیہ" بھی زیادہ خوش نہیں ہو سکتا اور اگر قومیت و وطنیت کا مطالبہ کچھ اور ہے، تو ہم کو اپنے اندر "اجتماعی وحدت" کی روح پیدا کر کے مقابلہ کرنا چاہئے اور اس روح کے پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر وقت شاید ہی کبھی مل سکے!

جنگ کا موجودہ رخ
روس میں لڑائی کے تین محاذ اب بھی بدستور قائم ہیں اور سوائے اس کے کہ فوجی نقطہ نظر سے ان کی ہندسی شکلیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں، ابھی تک کوئی نمایاں تغیر ان میں پیدا نہیں ہوا

جرمنی برابر آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا ہے اور باوجود برفباری شروع ہونے کے، لڑائی کی گرمی اسی طرح قائم ہے۔ لینن گراڈ کے محاذ پر بیشک جرمن زور گھٹ گیا ہے لیکن نہ اتنا کہ روس اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے، ماسکو کی طرف بھی جرمن فوجوں کا دباؤ کچھ کم ہو گیا ہے، لیکن نہ اس قدر کہ ماسکو خطرہ سے دور ہو گیا ہو، اسی کے ساتھ جب ہم کریمیا کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو صورت اور زیادہ بھیانک نظر آتی ہے۔ اوڈسیہ کا سقوط ہی اپنی جگہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا کہ کیف، پولٹاوا اور خارکوف بھی ہاتھ سے نکل گئے اور اس طرح اوکرائن کا زرخیز علاقہ بالکل جرمن قبضہ میں چلا گیا۔ خیال تھا کہ اوکرائن کے بعد جرمن فوجوں کا سارا دباؤ ماسکو کی طرف بڑھ جائے گا، لیکن انھوں نے اس کے بعد ہی کریمیا کی طرف اقدام شروع کر دیا اور وہاں بھی اپنے پاؤں جمائے۔ چنانچہ اس وقت بحر اوقیانوس کے اکثر ساحلی مقامات روس کے قبضہ سے نکل چکے ہیں صرف ایک روسٹوف باقی ہے، لیکن وہاں بھی صورت حال بہت نازک ہے

یہ بات اب بالکل واضح ہو گئی ہے کہ یا تو جرمنی اب براہ قاف بالکو کے پڑوسی چشموں اور ایران کی طرف بڑھنا چاہتا ہو اور اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو ایران اور روس کے درمیان اپنی فوجوں کی آہنی دیوار قائم کر دے گا تاکہ ایران کی طرف سے برطانیہ و امریکہ کی مدد، ایران کو نہ پہنچ سکے
روسی حکومت ماسکو سے منتقل ہو کر سمارا آگئی ہے اور ماسکو کے تین لاکھ ۵۰۰ میل کے اندر سخت لڑائی ہو رہی ہے

مشرق کی طرف سے ماسکو بالکل کھلا ہوا تھا، لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ جرمن فوجوں کا رخ اس طرف بھی ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو ماسکو چاروں طرف سے گھر جائے گا

اس میں شک نہیں کہ یہاں برفباری شروع ہو گئی ہے اور بارش نے بھی جرمن فوجوں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا ہے لیکن اس سے روسیوں کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ سرد رسانی کے ذریعے روز بروز سرد ہوتے جاتے ہیں اور اگر جرمن فوجیں بغیر آگے بڑھے ہوئے صرف محاصرہ ہی پر قناعت کریں تو بھی ماسکو کے لئے جانبر ہونا مشکل ہے

لینن گراڈ کی طرف کہا جاتا ہے کہ روسی فوجوں نے کہیں کہیں جارحانہ قدم اٹھایا ہے، لیکن یہ حالات موجودہ جبکہ ماسکو اور لینن گراڈ کی سڑک پر دشمن کا قبضہ ہے اور کافی فاصلہ بھی خطرہ میں ہے، روسی توقعات مشکل ہی سے پوری ہو سکتی ہیں

اس میں شک نہیں کہ لینن گراڈ کے محاصرہ کو بہت دن ہو چکے ہیں، لیکن روسی پلہ اب تک یہاں کمزور ہے اور سردیاں شروع ہو جانے کے بعد بھی کوئی توقع اس لئے قائم نہیں کی جاسکتی کہ یہاں زیادہ تر فوجیں لینن گراڈ کی فوجوں سے کام لیا جا رہا ہے جو برفستانی لڑائیوں کے انداز سے پوری طرح واقف ہیں۔ لینن گراڈ کی طرف جرمنی کی پالیسی شروع سے یہ رہی ہے کہ فن لینڈ کی دلچسپیاں اس طرف سے کم نہ ہونے پائیں اور ہو سکتا ہے کہ لینن گراڈ کے مسئلہ میں اس نے اسی لئے ڈھیل ڈال رکھی ہو

الغرض روس کی حالت بہت نازک ہوتی جا رہی ہے اور جرمنی کے اقدامات زیادہ ہوتے جا رہے ہیں، لیکن ان ناموافق حالات کے باوجود ایک چیز ایسی ہے جو روس کی آخری کامیابی کی طرف سے ہمیں بالکل مایوس نہیں ہونے دیتی، اور وہ یہ کہ یہاں کی فوج اور آبادی نے آخری سانس تک مقابلہ کا عزم کر لیا ہے اور قوموں کی قسمتیں پلٹنے میں ہمیشہ عزم و ارادہ ہی کو زیادہ دخل رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانیہ اور امریکہ نے بھی اپنی جگہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ روس کو مدد پہنچانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھانے نہیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ مدد کوئی معمولی مدد نہ ہوگی، لیکن اس سلسلہ میں اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جنگ کا اثر روس کی اشتراکی حکومت پر کیا ہوگا

اشتراکیت کا مستقبل ہٹلر کا پروپاگنڈہ ہے کہ یہ جنگ روس کے خلاف نہیں بلکہ وہاں کی اشتراکی حکومت کے خلاف لڑی جا رہی ہے اور چونکہ اشتراکیت سے سارا یورپ گھبرایا ہوا ہے اس لئے اس جہاد میں جرمنی کے ساتھ اور بھی متعدد حکومتوں کی ہمدردیاں شامل ہو گئیں

چونکہ امریکہ اور انگلستان میں بھی بڑی جماعت اشتراکیت کے خلاف ہے، اس لئے ہٹلر سمجھتا تھا کہ ان دونوں ملکوں کو بھی روس کا ساتھ دینے کی ہمت نہ ہوگی، لیکن چونکہ یہ جنگ جمہوریت و ناسیت کی جنگ ہو گئی ہے اس لئے برطانیہ نے ناسیت کو فنا کرنے کے لئے روس کی مدد کرنے کا اعلان کر دیا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہ دیا کہ اشتراکیت کے خلاف برطانیہ کی پالیسی بدستور وہی رہے گی۔ یہی روش بالکل امریکہ کی بھی ہے۔ اس لئے روس اس جنگ میں کامیاب ہو یا ناکام، دونوں صورتوں میں روس کی موجودہ اشتراکی حکومت کو ختم ہو جانا ہے

اگر جرمنی کو کامیابی حاصل ہوتی ہے، تو ظاہر ہے کہ روس میں جو نئی حکومت قائم ہوگی وہ ہٹلر کی پسند کی ہوئی ہوگی اور اس میں اشتراکیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی جائے گی، لیکن اگر ہٹلر مار گیا، تو بھی اشتراکیت کا خاتمہ ہی سمجھئے

اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ روسی اور اشتراکی ان دونوں کا فرق معلوم کر لیں۔ روسی آبادی اتنے بڑے حصہ زمین پر پھیلی ہوئی ہے جو بحر اٹلانٹک کے رقبہ کا چوگنا ہے اور خطا ہر ہے کہ ایشیا و یورپ کے اس وسیع قطعہ زمین پر جو حکومت قائم ہوگی وہ ایک وسیع سلطنت کی حیثیت رکھے گی اور وہاں کے نظام حکومت کا اثر یقیناً بڑا دور رس ہوگا، اسی لئے روس کی سیاسی تاریخ میں یہاں کی آبادی اور اس کے جذبات کو بڑا دخل رہا ہے۔

اگر صدیوں تک زار کی جابرانہ حکومت قائم رہی تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ روسی آبادی میں آزادی کا جذبہ نہ پایا جاتا تھا بلکہ صرف یہ کہ وہاں کی روایتی زندگی کی آڑ میں جو کیسے جابلانہ چیز ہے، روسی امراء نے جذبہ حریت کو ابھرنے نہ دیا اور اسی لئے جب تک اس روایتی زندگی پر کاری مغرب نہیں لگائی گئی، وہاں انقلاب نہ ہو سکا۔ روس کی تاریخ انقلاب اور اشتراکیت کا مستقبل سمجھنے کے لئے تین باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ایک روس والوں کی مذہبیت، دوسرے تاریخوں کا حملہ اور تیسرے پیٹر اعظم کی اصلاحات۔

روسی نے دسویں صدی کے اخیر میں عیسوی مذہب اختیار کیا، لیکن چونکہ یہ چیز انہیں کلیسا سے روم سے نہ ملی تھی اس لئے وہ انضباط و اتحاد جو رومن قانون اور یورپین کلیچہ کی جان ہے ان میں پیرا نہ ہوا تھا۔ اس کے بعد تاریخوں کے حملے نے ان کے عادات و خصائل کو بہت متاثر کیا اور کامل ڈھائی سو سال تک تاتاری جو ان کی گردن میں پڑا رہا، لیکن جب یہ تاتاریوں کی غلامی سے آزاد ہوئے تو بھی اس انداز سے کہ انہیں پہلے شخصی حکومت کے سامنے جھکنا پڑا۔

پیٹر اعظم سب سے پہلا فرمانروا تھا جس نے روس کو یورپین حکومتوں کی برادری میں شامل کیا لیکن اس اصلاح نے روسی قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور جدید و قدیم خیالات کی دو جماعتیں وہاں قائم ہو گئیں۔ جب سلسلے میں وہاں انقلاب رونما ہوا تو یہی کشاکش جاری تھی۔ لیکن بعض انتہا پسند افراد نے جو حکومتوں کی تاریخ اور انقلابات کا مطالعہ کر چکے تھے، ان دونوں جماعتوں کے اختلاف کو دور کر کے آزادی کا جدید ترین نظام حکومت قائم کرنا چاہا اور لیٹن جو انقلابی تحریک کی چالوں سے واقف تھا کامیاب ہو گیا۔

اس نے مرکزی حکومت پر اقتدار حاصل کر کے مخالفین کو قتل کرنا شروع کیا اور اشتراکی نظام قائم کر دیا۔ سرچند لیٹن نے یہ سب کچھ ذاتی اقتدار کے لئے نہ کیا تھا بلکہ تمام قوم کی فلاح کا سوال اس کے سامنے تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ لیٹن کی حکومت بھی ایک قسم کی آمرانہ حکومت تھی۔

لیٹن کے بعد اسٹالین ابھرا اور اس کے زمانہ میں اشتراکیت کے اصول میں بہت کچھ تبدیلی پیدا ہو گئی۔ پھر اب کہ ایک طوفان جرمی سے اسے جنگ کرنا پڑ رہی ہے اور دوسری طرف برطانیہ و امریکہ کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہے، جن میں ہر فریق اشتراکیت کا مخالف ہے، اشتراکیت کا مستقبل زیادہ تاریک ہو گیا ہے اور روس کو چاہے فتح حاصل ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں اشتراکیت تقریباً ختم ہو جائے گی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہٹلر نے تو ساری دنیا سے اپیل کی ہے کہ وہ اشتراکیت کے خلاف جہاد کر رہا ہے اس لئے سب کو اس کی مدد کرنا چاہئے، لیکن اسٹالین نے دنیا کی اشتراکیت پسند جماعتوں سے مدد کی کوئی اپیل نہیں کی، حالانکہ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسٹالین جانتا ہے اگر اس نے اس جنگ کا مقصد اشتراکیت کی حمایت

قرار دیا تو برطانیہ اور امریکہ کبھی اس کی مدد نہ کریں گے

آپ نے اس دوران میں روسی مقررین کی زبان سے مذہبی آزادی کا ذکر بھی سنا ہوگا اور آپ نے مسٹر روزولٹ کی وہ تقریریں بھی سنی ہوں گی جن میں اس نے روسی حکومت کو ملک کے اندر مذہبی آزادی دینے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ سب علامتیں ہیں اس بات کی کہ روس کے اشتراکی اصول میں تغیر پیدا ہو جانا ضروری ہے

مارکس کے اصول اشتراکیت میں دو باتیں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، ایک یہ کہ ذاتی ملکیت ختم کر کے آبادی کی فرقہ وارانہ تقسیم مٹا دی جائے اور دوسرے یہ کہ خدا اور اس کے وجود کے اعتقاد کو ذہن انسانی سے محو کر دیا جائے کیونکہ اب ذہن انسانی ترقی کر کے حدود مذہب سے دور نکل گیا ہے۔ پھر برطانیہ اور امریکہ کی عیسوی حکومتیں کسی وقت اس بات پر تو راضی ہو سکتی ہیں کہ سرمایہ داری کو ختم کر کے اشتراکیت سے قریب تر ہو جائیں، لیکن مذہب کے باب میں وہ اصول اشتراکیت کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتیں، چنانچہ چرچل اور روزولٹ دونوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ روس کی مدد صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ مقصود ہٹلر کو شکست دینا ہے درجہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے وہ روس کے شدید مخالف ہیں۔ گویا روس کو برطانیہ و امریکہ کی یہ مدد ”حُبِ علی“ نہیں بلکہ ”بغضِ معاویہ“ کی صورت رکھتی ہے

پھر اسٹالین اتنا بیوقوف نہیں کہ وہ روس کے موجودہ موقف سے آگاہ نہ ہو، وہ جانتا ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ تنہا جرمنی سے مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت نہیں اور امریکہ و برطانیہ کی مدد حاصل کرنے کے عوض میں اسے اشتراکیت کی قربانی ضرور کرنا پڑے گی

اگر آج لڑائی کے زمانہ میں برطانیہ و امریکہ، روس کے شریک ہیں تو اصولاً صلح کے وقت بھی ان کی شرکت کو تسلیم کیا جائے گا اور جرمنی کی شکست کے بعد انھیں شرائط کو فوقیت حاصل ہوگی جو امریکہ و برطانیہ کی طرف سے پیش کی جائیں گی اور ظاہر ہے کہ یہ شرائط کبھی اشتراکیت کے موافق نہیں ہو سکتیں

کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بدلنا ضروری ہے، لیکن وہ نظام کیا ہوگا، اس کا صحیح علم کسی کو نہیں، تاہم اس کی ایک نمایاں ترین خصوصیت کا علم ضرور ہے اور وہ یہ کہ اشتراکیت کم از کم پچاس سال کے لئے سمجھے ڈھکیل دی جائے گی اور سرمایہ داری ایک نئی صورت اختیار کر کے سامنے آئے گی، جسے ہم نہ جمہوریت کہہ سکیں گے نہ آمریت !

زمانہ نام ہے سلسلہ انقلابات کا اور کائنات کی ہر شے میں ہر وقت تغیر ہو رہا ہے، لیکن بعض تغیرات ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم محسوس نہیں کرتے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کے نتائج سے بخیر رہتے ہیں۔ اس جنگ کے بعد جو انقلاب ہونے والا ہے، اس کی نوعیت چاہے کچھ ہو، لیکن ہم اسے محسوس کرنے پر بھی مجبور ہوں گے اور اسکے نتائج سے متاثر ہونا بھی ہمارے لئے ناگزیر ہوگا۔ پھر بعض قومیں ایسی ہوں گی، جو اس سے فائدہ اٹھا کر حیات جدید کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں گی اور بعض وہ جنگی غلامی کی زنجیریں اور زیادہ جکڑ جائیں گی۔ یعنی ایک کا تاثر اسے گڑھے سے نکال کر اوپر لے آئے گا اور دوسرے کا تاثر اسکے جمود کو زیادہ سخت و سنگین بنادے گا۔ ہندوستان کا کیا حشر ہوگا، اس کا صحیح علم تو کسی کو نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس وقت تک ہمارے لیڈروں کی عقلیں سدھر گئیں یا ہم اپنے لیڈروں کی طرف سے بے نیاز ہو کر خود سوچنے اور سمجھنے کی طرف مایل ہو گئے، تو ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا بھی کوئی نیا ورق اٹھا جائے اور یہ ورق شاید مکروہ نہ ہو۔

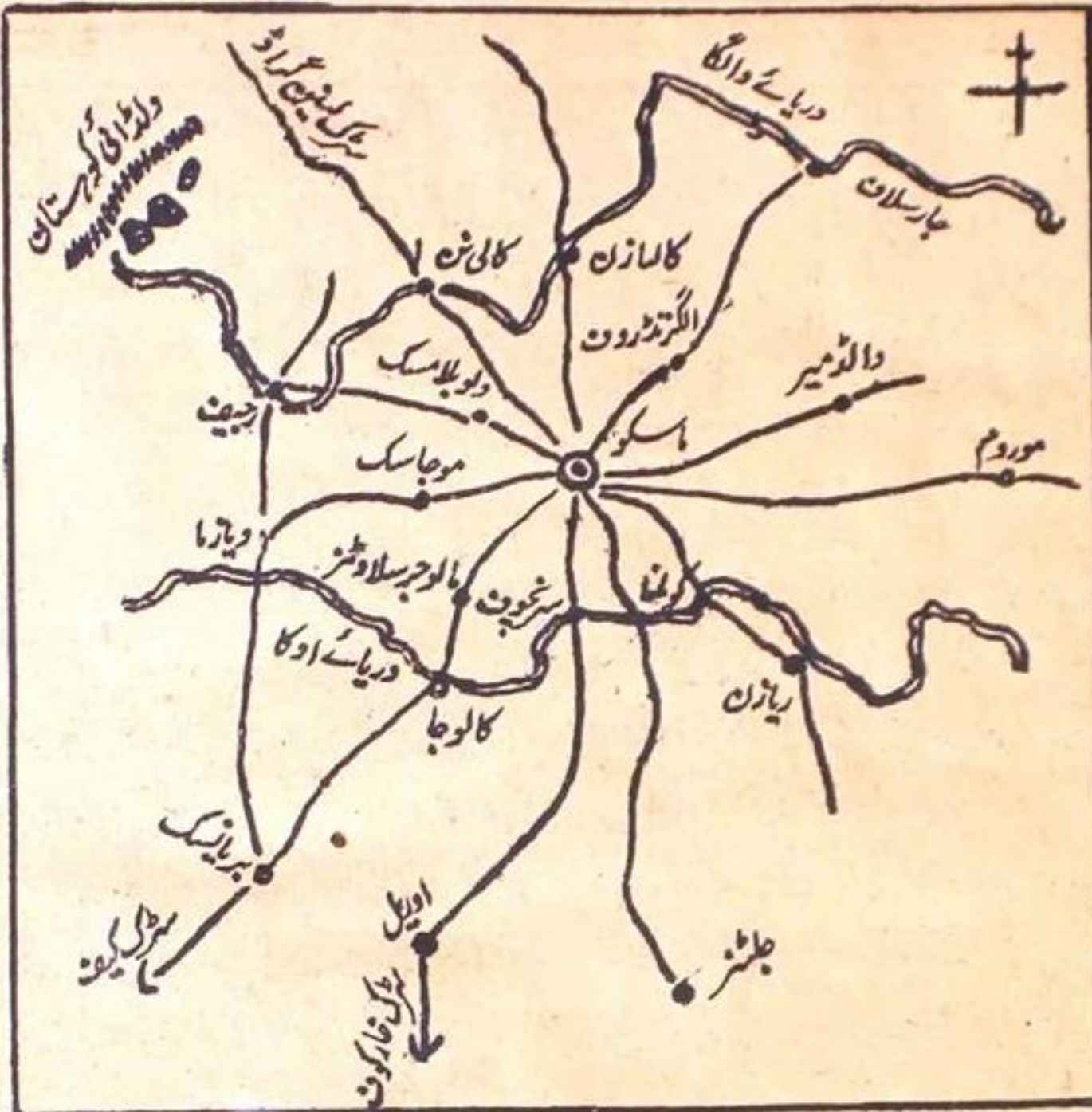
ماسکو کا محاذ

۳۰ اکتوبر کو ماسکو کے محاذ کی جو حالت تھی وہ سچ کو پہلو کے نقشے سے معلوم ہو سکے گی۔

ماسکوں کے چاروں طرف سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے جو ملک کے مختلف سمت کو جاتی ہیں اور انھیں سڑکوں پر اس وقت لڑائی ہو رہی ہے۔

شمال کی طرف جرمن فوجیں کالی نین تک پہنچ گئی تھیں جو ماسکو سے ۲۵۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ لیکن اب وہ ماسکو سے صرف ۳۰ میل دور ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی قوی امکان ہے کہ وہ دریائے والگا کے داہنے ساحل سے ہوتی ہوئی الگزنڈروف تک پہنچ جائیں گی اور مشرق کی طرف ماسکو کو گھیر لیں گی۔

جنوب کی طرف کالوجا اور ریازان کی طرف سے جرمن فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں اور اگر یہ فوجیں الگزنڈروف تک پہنچنے والی فوجوں سے مل گئیں تو ماسکو کا مشرقی سمت بالکل غیر محفوظ ہو جائے گا۔ شمالی مغرب کے گوشہ میں لوبلا مسک تک اور مغرب میں موجاسک اور مالوجا روسلاوٹسک جرمن فوجیں پہنچ گئی ہیں تازہ خبروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانچ جرمن ڈویژن سر پوٹوٹ اور کولومنا کی طرف بڑھ رہی ہیں اور اگر اس میں جرمنوں کو کامیابی ہو گئی تو جنوب کی طرف سے ماسکو پر سخت حملہ ہوگا۔ مشرق کی طرف جو فوجیں کالوجا، اوویل اور تولا کی طرف آگے بڑھ رہی ہیں وہ غالباً ریازان کی فوجوں سے مل جائیں گی اس طرح ماسکو آہستہ آہستہ سخت محاصرہ میں آتا جا رہا ہے۔ لیکن روسی جرمن فوجوں کو نہایت جرأت کے ساتھ آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں، اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ اور کیا نئی صورت پیدا ہوگی۔



آئندہ جنوری کے "نگار" کی اہمیت

کا اندازہ آپ یوں نہیں کر سکتے۔ پہلے آپ جنوری ۱۹۴۱ء کے "نگار" کو سامنے رکھئے کہ وہ بجائے خود کتنی اہم چیز ہے اور پھر اسی کے ساتھ آپ یہ دیکھئے کہ تمام ان اساتذہ غزل کے کلام پر جن کا ذکر آپ جنوری ۱۹۴۱ء کے نگار میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، ملک کے بہترین نقادوں کی تفصیلی رائے ایک جگہ آپ کو معلوم ہو سکے تو یہ دونوں باتیں ملکر کتنی عظیم الشان ادبی خدمت قرار پائے گی۔

جنوری ۱۹۴۲ء کے "نگار" میں انھیں تمام شاعروں کے متعلق ملک کے چار مسلم البثوت نقادوں کی نہایت بسیط و مفصل رائے آپ کے سامنے پیش کی جائے گی اور آخری مضمون اڈیٹر نگار کا ہوگا، جس میں تمام انتقادی مقالات کو سامنے رکھ کر بتایا جائے گا کہ اس میزان میں ان شاعروں کی قدر و قیمت کیا قرار پائی۔

اگر آپ کے پاس جنوری ۱۹۴۱ء کا "نگار" موجود ہے تو جنوری ۱۹۴۲ء کا نگار حاصل کرنا آپ کے لئے ضروری ہے، کیونکہ یہ دونوں ملکر ایک مکمل چیز بنتے ہیں اور اگر جنوری ۱۹۴۱ء کا "نگار" آپ کے پاس نہیں ہے، تو جلد طلب فرمائیے، کیونکہ ممکن ہے پھر آپ کو نہ مل سکے۔

اگر آپ کی خریداری سال حال میں جنوری کے بعد کسی مہینے سے شروع ہوئی ہے تو اپنی خریداری جنوری ۱۹۴۱ء سے شروع کیجئے اور دفتر کو اطلاع دیجئے تاکہ جنوری اور اس کے بعد کے پرچے آپ کو بھیج دئے جائیں اس صورت میں جنوری ۱۹۴۱ء کا پرچہ آپ کو یونہی مل جائے گا۔ لیکن اگر آپ مناسب نہیں سمجھتے تو صرف جنوری ۱۹۴۱ء کا پرچہ طلب فرمائیے، لیکن اس صورت میں اس کی قیمت آپ کو علاوہ فحصول دور و پیہ ادا کرنا پڑے گی۔

بہر حال آئندہ جنوری ۱۹۴۲ء کا "نگار" نہایت اہم چیز ہے اور اگر آپ اس سے پورا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو جنوری ۱۹۴۱ء کا "نگار" بھی آپ کے پاس ہونا ضروری ہے تاکہ ان دونوں کو آپ ایک جلد میں مجلد کرا سکیں۔

منیجر نگار

ہندوستانی صحافت بیسویں صدی میں

(مسل)

پہلا دور

ہندوستانی رائے عامہ کے ارتقا کی تاریخ میں بیسویں صدی کا آغاز بیدار ہمت رکھتا ہے۔ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ملکی اور غیر ملکی صحافت کے درمیان خط امتیاز قائم کیا۔ ہندوستان کے انگریزی اخبارات کے یورپین اڈیٹروں نے اس وقت تک حکومت کے ان اقدامات کے خلاف آواز بلند کی تھی، جو غیر دانشمندانہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز نے صورت حال بدل دی اور ملک کے ”انگلو انڈین اخبارات“ نے حکومت کی تائید شروع کی۔ ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا اور اُن کی جگہ پر ایڈورڈ ہفتم بادشاہ ہوئے، ہندوستان میں یہ لارڈ کرزن کا دور حکومت تھا۔ ۱۹۰۳ء کے اخیر میں حکومت نے ایک نیا قدم اٹھایا۔ سرکاری معاملات کی رازداری کے لئے جو قانون ۱۸۸۹ء میں پاس ہوا تھا، اُس میں حکومت نے ترمیم کی جس سے حکومت کے اختیارات بے حد وسیع ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کی زد میں آنے والے اخبار کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس ترمیم کے خلاف اخبارات نے بہت شور و غل مچایا۔ (اس سلسلہ میں گوپال کرشن گوکھلے کی خدمات بہت زیادہ قابل قدر تھیں) لیکن ہندوستان کے غیر ملکی اخبارات نے اس موقع پر حکومت کی تائید کی۔

۱۹۰۵ء میں ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا جس نے رائے عامہ کی بیداری میں بڑا حصہ لیا۔ لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں بنگال کو ہندو مسلم حلقوں میں تقسیم کیا۔ اس کا واحد مقصد بنگالیوں کی روز افزوں طاقت کو روکنا تھا۔ اسٹیٹسمن جو ہندوستان میں برطانوی خیال کا نمائندہ تھا، اُس نے اپنے ایک اقتراح میں تقسیم بنگالہ کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں لکھا کہ:

”مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو آگے بڑھانے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ملک میں ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کی بڑھتی ہوئی

قوت کا ہم پر آسانی سے باب کر سکیں۔“

بنگالیوں نے اس تقسیم کے خلاف زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ اُس وقت کلکتہ میں ہندوستانی خیال کی نمائندگی

at The "Statesman", Quoted by K. S. S. Kelvanekar
in "The Problems of India".

”برنگالی“ کر رہا تھا (جس کے اڈیٹر سریندر ناتھ ہنرجی تھے) اور مدراس میں ”ہندو“ بھی پیش پیش تھا۔ لیکن انگریزی خیالات کی ترجمانی کرنے والے بہت سے اخبارات تھے چنانچہ اس سلسلہ میں کلکتہ کا اسٹیشنریں۔ لامور کا سول اینڈ ٹری گزٹ۔ الہ آباد کا پائیر (جواب لکھنؤ سے نکلتا ہے) اور بمبئی کا ٹائمز آف انڈیا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ابھی اس تقسیم کے خلاف ملک کے طول و عرض میں شورش برپا ہی تھی کہ لارڈ ڈکڑن نے چلتے چلتے ایک اور حرکت کی یعنی کلکتہ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے موقعہ پر انھوں نے اپنی تقریر میں جی کھول کر مشرقیوں کو عموماً اور ہندوستانیوں کو خصوصاً خوب خوب صلواتیں سنائیں۔ اس تقریر نے سارے ملک میں غیظ و غضب کی لہر دوڑادی۔

لارڈ ڈکڑن کا یہ اقدام یقیناً غیر دانشمندانہ تھا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ:

”لارڈ ڈکڑن کے ہفت سالہ دور حکومت نے ہندوستانیوں میں اس بات کا احساس پیدا کر دیا کہ حکومت کو

ہندوستانی رائے عامہ کی طرف متوجہ کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ کوئی مضبوط قدم اٹھایا جائے“

اس احساس نے بہت جلد ”سودیشی تحریک“ کی شکل اختیار کی۔ دوسری طرف ہندوستانی معتدلیں اصلاحات کے لئے شورش مچا رہے تھے۔ ان سب پر بالا وہ بیچینی تھی جو ملک کے کاشتکاروں میں پیدا ہو رہی تھی۔ پنجاب میں اُس کا سب سے زیادہ زور تھا، وہاں اس تحریک کے لیڈر لالہ لاجپت رائے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں حکومت نے اُن کو جلاوطن کر دیا۔ ہندوستان کے اخباروں نے اس کے خلاف بہت احتجاج کیا۔

ان حالات نے ملک میں اخبار بینی کا شوق پیدا کیا جو روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ اس دور میں ہندوستان نے جو نئے اخبار نویس پیدا کئے اُن میں سے سب ایک ایک کر کے ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ اُن میں قابل ذکر سر چنتا منی۔ جی۔ اے۔ ٹنسن (G. A. Tansley)۔ مہادیو گوند رانڈے اور تلک وغیرہ تھے۔

۱۹۰۹ء میں ہندوستان کو ”منشور مورے اصلاحات“ (Minto-Morley Reforms)

عطا ہوئے۔ ان اصلاحات کے نفاذ سے پہلے ہی حکومت کئی بار اس کا اظہار کر چکی تھی کہ ہندوستان کے لئے اصلاحات زیر غور ہیں۔ ہندوستان کے تمام سیاسی حلقے عموماً اور اعتدال پسند لوگ خصوصاً ان اصلاحات کے متعلق بڑی بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے، لیکن جب ان کا اعلان ہوا تو ہر شخص کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ان اصلاحات کی سب سے بڑی خصوصیت جداگانہ انتخاب تھا۔ ممبران کونسل کی تعداد میں اضافہ ہوا، منتخب شدہ ممبر بھی بڑھا دئے گئے، نیز ممبروں کو ”مفاد عامہ“ کے متعلق تجاویز پیش کرنے، بجٹ پر بحث کرنے اور سوالات کرنے کا بھی حق دیا گیا۔

ہم ابھی کہ چکے ہیں کہ ان اصلاحات سے ملک کا کوئی طبقہ خوش نہ تھا۔ لیکن معتدلیں اُن کو قبول کرنے کے لئے طیار ہو گئے تھے۔ اس لئے اب ہندوستانی رائے عامہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور اس چیز نے اخبارات کے لئے ایک گونہ دشواری پیدا کر دی۔

تقسیم بنگالہ کے بعد سے بنگال کی سیاست تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور اس سلسلہ میں دہشت انگیزی بھی ترقی کر رہی تھی۔ ۱۹۰۹ء کے اوائل میں ”ایمپیریل پریس کانفرنس“ (Imperial Press Conference) لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی نمایندگی سرندرناتھ بنرجی، ایڈیٹر بنگالی نے کی۔ اس موقع پر کانفرنس کے ایک ممبر نے سرندرناتھ بنرجی سے اپنی تقریر کے دوران میں سوال کیا کہ: ”کیا دہشت انگیزی کی تحریک کی تمام ذمہ داری اُن ہندوستانی اخبارات پر عائد نہیں ہوتی، جن کو اپنے قلم پر قابو نہیں ہو؟ اس الزام کی تردید کرتے ہوئے سرندرناتھ بنرجی نے بتلایا کہ دہشت انگیزی مشرق کی نہیں بلکہ مغرب کی پیداوار ہے۔ اس زمانہ میں حکومت، ملک کے بڑھتے ہوئے سیاسی رجحانات اور اخبارات کے تلخ انداز بیان کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں اخبارات پر قابو حاصل کرنے کے لئے ایک نیا قانون (The Indian Press Act) بنایا گیا۔ ہندوستانی ممبروں میں کچھ لوگ اس کے خلاف تھے۔ خصوصاً مسٹر سنہا (جو آگے چل کر لارڈ سنہا بنے) اس کے بہت خلاف تھے مگر عین وقت پر مخالفین بھی اس کے موید ہو گئے۔ کونسل کے پہلے ہی جلسہ کے موقع پر ۲۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو کسی شخص نے دن دھاڑے کلکتہ ہائی کورٹ کے اندر پولیس کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اس حادثہ نے پوری صورت حال بدلی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر یہ واقعہ نہ پیش آیا ہوتا تو مسٹر سنہا اس بل کے سلسلہ میں ممبری سے مستعفی ہو جاتے۔ بہر حال یہ بل قانون بن ہی گیا۔ اس قانون میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ اخباروں اور چھاپہ خانوں سے رقم ضمانت جمع کرائی جائے اور پھر تادیباً اسے ضبط کر لیا جائے۔

لارڈ فٹو کی جگہ لارڈ ہارڈنگ، ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہوا اور اُن کی جگہ جارج پنجم بادشاہ ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں اُن کی تاجپوشی کا دربار دہلی میں منعقد ہوا۔ اس دربار میں بنگال کی تقسیم کی تنسیخ کا اعلان کیا گیا۔ نیز بنگال کو پریسیڈنسی صوبہ بنانے اور ہندوستان کے دارالسلطنت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان کیا گیا۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ کے اعلان نے مسلمانوں میں بڑی بھینپی پیدا کی کیونکہ حکومت نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ تقسیم بنگال کا مقصد دراصل ہندوستان میں ایک اسلامی صوبہ کا قیام تھا۔ حکومت کے اس اعلان نے مسلمانوں میں بے چینی پیدا کر دی تھی لیکن سر آغا خاں اور مسلم لیگ کے دوسرے سربراہ اور وہ حضرات نے مسلم جماعت کی اس بے چینی کو ختم کر دیا۔

جہاں تک سیاسی مسلک کا تعلق تھا، کامرٹھ ”ارباب علیگڑھ کا خوشہ چیں“ تھا جن کو اُس زمانہ کے تعلیم یافتہ مسلمان مذہب اور سیاست میں اپنا قطعی رہنما سمجھتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے اہلال جاری ہوا جو اپنے سیاسی، علمی و دینی مباحث کے اعتبار سے یورپ اور امریکہ کے بلند پایہ رسائل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے مسلمانوں کے اندر سیاسی و مذہبی انقلاب پیدا کرنے میں بڑی مدد کی۔

بیسویں صدی میں ہندوستانی صحافت کا پہلا دور ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۱۱ء تک جاری رہا۔ اس دور میں دو قابل ذکر اخبار جاری ہوئے جو اب تک زندہ ہیں۔ ایک الہ آباد کا لیڈر اور دوسرا بمبئی کا ”مہی کرانیکل“۔ لیڈر کو ۱۹۰۹ء

میں پنڈت مدن موہن مالوی نے جاری کیا اور مسٹر چیتا مٹی آنجہانی نے چار چاند لگا دئے۔ اس اخبار کے ہمدردوں میں ہم کو ڈنشاواچا اور فیروز شاہتا وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ معتدلیں کا اخبار تھا اور آج بھی اعتدال پسند نقطہ خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔

بمبئی کرائیکل کا اس دور کے اختتام سے کوئی ڈیڑھ سال قبل یعنی ۲ مارچ ۱۹۰۳ء کو بمبئی سے اجرا ہوا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر مشہور غیر ملکی محب ہندوستان (Benjamin Guy) تھے۔ آپ اس سے قبل انگلستان کے مائیکسٹر گارڈین اور اسٹیشنر کلکتہ کے مدیر رہ چکے تھے۔ تقسیم بنگالہ کے خلاف بنگالیوں نے جو تحریک شروع کی تھی مسٹر باری مین نے اس تحریک کے ساتھ صرف ہمدردی ہی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ علی طور پر اس میں حصہ بھی لیا تھا۔ بمبئی کرائیکل بھی لیڈر کی طرح معتدلیں کی نمائندگی کے لئے نکالا گیا تھا مگر وہ آگے بڑھ کر انتہا پسند ہو گیا اور جنگ کانگریس کے نقطہ خیال کی نمائندگی کر رہا ہے۔ باری مین کے بعد بمبئی کرائیکل کے ایڈیٹر مشہور نو مسلم اہل قلم مسٹر پکتھال مرحوم ہوئے اور ان کے بعد اس کے ایڈیٹر مسٹر سید عبداللہ بریلوی ہوئے جو اب تک یہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور جن کو ملک کے اخبار نویسوں میں بہت عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

پچھلی جنگ عظیم اور اس کے بعد

۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جنگ کا آغاز ہوا اور بقول مارگریٹا بارس :-

”اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں شدید کشمکش کا دور شروع ہوا یہ دور خود حکومت کے لئے بھی کچھ کم پریشان کن نہ تھا۔۔۔۔۔ اس وقت ہندوستان سے ایک ایسی لڑائی کے لئے مدد مانگی جا رہی تھی جو ”خود اختیاری“ (Self-determination) کے لئے لڑی جا رہی تھی اور یہ ایک ایسا مقصد تھا جس کے حصول کے لئے خود ہندوستان کئی پشتوں سے جدوجہد کر رہا تھا۔“

آغاز جنگ کے ساتھ ہی حکومت نے ڈفنس آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ ضروری سمجھا۔ اس وقت ہندوستانی اور انگلو انڈین اخبارات کے زاویہ نگاہ میں قطبین کا فرق ہے۔

اس دور کے وہ واقعات جو صحافت پر اثر انداز ہوئے یا جن کا صحافت سے تعلق ہے اختصار کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں :-

اس زمانہ میں بہت سے ہندوستانی اخبارات کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ اکثر اخبارات کے ایڈیٹر اور بہت سے لیڈر نظر بند کر دئے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کے دو مشہور محب وطن سر فیروز شاہ جتتا اور گوگلے کا انتقال ہوا۔

۱۹۴۷ء میں لارڈ چیمسفورڈ ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں دیے لفظوں

میں یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کے اندر اصلاحات کے نفاذ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس اظہار خیال نے ہندوستانی رائے عامہ کو بیدار کر دیا۔ اسی سنہ میں مسٹر اینی بیسنٹ نے مدراس کے مشہور اخبار ”مدراس اسٹینڈرڈ“ کو خرید کر ”نیو انڈیا“ کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ اُن کے اخبار کی ضمانت ضبط کی گئی اور دس ہزار کی مزید ضمانت کا مطالبہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں مسٹر اینی بیسنٹ نے پریوی کونسل میں اپیل کی جو کامیاب رہی اور حکومت مدراس کو اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا۔

اسی سنہ میں وائسرائے کی خدمت میں اخبار نویسوں کا ایک وفد حاضر ہوا۔ اس وفد نے اپیل کی کہ حکومت ۱۹۱۱ء کے قانون مطابعت کو منسوخ کر دے۔ لیکن وائسرائے نے اس کے جواب میں اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک بیلٹی بیرو شملہ میں قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد اخبارات اور حکومت کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنا تھا۔ اور اسی سنہ میں سرورنٹ آف انڈیا سوسائٹی کے آرگن ”سرورنٹ آف انڈیا“ کا پونہ سے اجراء ہوا اور اسی سنہ کے آخری زمانہ میں لڑائی کا بھی خاتمہ ہوا۔

۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ پاس ہوا۔ اس ایکٹ کی شان نزول یہ تھی کہ ۱۹۱۱ء میں حکومت نے ایک کمیٹی مسٹر رولٹ کی صدارت میں مقرر کی۔ اس کمیٹی کا کام دہشت انگیزی کی تحریک کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کرنا اور اُس کے اشعار کی تدابیر تجویز کرنا تھا۔ حکومت نے اس کمیٹی کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جلد ہی بل کی شکل میں مرتب کر کے قانونی درجہ دیدیا۔ اس قانون کے مطابق جج بلاجوری کے سیاسی مقدمات کی سماعت کر سکتے تھے اور پھر اُن کے فیصلوں کی اپیل بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ نیز وہ لوگ جن کو سیاسی وجوہ کی بنا پر مشکوک سمجھا جائے، اُن سے ضمانتیں اور مچلکے طلب کئے جاسکتے تھے اور اُن کو غیر معین وقت کے لئے نظر بند کیا جاسکتا تھا۔

اسی سلسلہ میں جلیان والا باغ کا حادثہ پیش آیا۔ مدراس کے ”ہندو“ اور بمبئی کرانیکل کی ضمانتیں ضبط کی گئیں۔ بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر مسٹر ہارنی مین کو جلاوطن کیا گیا اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ اخبار کا افتتاحیہ سنسکر کرانے کے بعد چھاپا جائے۔ چند روز تک تو اس پر عمل ہوتا رہا مگر اس سلسلہ میں ایسی دشواریاں پیدا ہوئیں کہ ادارے نے یہ طے کیا کہ افتتاحیہ کی جگہ خالی چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہے۔

۱۹۱۹ء کے اوائل میں شمالی ہند سے ایک نئے روزنامہ کا اجراء ہوا۔ یہ موتی لال نہرو کا اخبار ”انڈین پینڈنٹ“ (Independent) تھا، جو الہ آباد سے نکلتا تھا۔ اس اخبار کے اجراء کے اسباب جو اہر لال نہرو نے بیان کرتے ہیں:-

”پنجاب کے واقعات اور اُن کی تحقیقات کا والد پر سید گہرا اثر ہوا۔ اب وہ اپنی پُرانی اعتدال پسندی سے بہت دور ہٹ چکے تھے۔ الہ آباد کے مشہور اخبار لیڈر سے غیر مطمئن ہو کر انھوں نے ۱۹۱۹ء کے اوائل میں اپنا ایک اخبار انڈین پینڈنٹ کے نام سے نکالنا شروع کر دیا۔“

اس اخبار کی مدت حیات زیادہ نہ تھی چنانچہ ۱۹۲۲ء میں وہ بند ہو گیا۔

یکم اگست ۱۹۷۱ء کو ملک اس دنیا سے گزر گئے۔ اُسی دن کانگریس نے اپنی تحریک ستیہ گروہ کا آغاز کیا۔ یہ تحریک کانگریس اور خلافت کی مشترکہ تحریک تھی۔ اسی زمانہ میں مانٹیکو جیمس فورڈ اصلاحات کی رپورٹ نے قانونی شکل اختیار کی۔ ملک کا انتہا پسند طبقہ اس اسکیم سے قطعاً مطمئن نہ تھا اور معتدلیں بھی کچھ زیادہ خوش نہ تھے، اس موقع پر انگلوانڈین اخبارات نے حکومت اور اصلاحات کی حمایت کی۔ ملکی اخبارات جو اعتدال پسند تھے وہ حکومت کی حمایت اور معتدلیں کی وکالت پر زور انداز میں کر رہے تھے۔ لیکن قوم پرور اخبارات انتہا پسندوں کے ہمنوا تھے۔

ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس کی سیاسی اُفتاد طبع انتہا پسندوں کے ساتھ لگانہ کھاتی تھی۔ لیکن وہ حکومت کے ساتھ بھی اُن قوانین کی موجودگی میں تعاون کرنے کے لئے طیار نہ تھا جو اس وقت موجود تھے۔ اسی طبقہ کو اپنا ہندو بنانے کے لئے حکومت نے مروجہ قوانین کی تحقیقات کے لئے کئی کمیٹیاں مقرر کیں۔ اسی سلسلہ میں ایک کمیٹی صحافت کے قوانین کی جانچ پڑتال کے لئے بھی قائم ہوئی۔ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ صحافت اور مطابع کے لئے تین قانون موجود تھے ایک ۱۹۶۶ء کا۔ دوسرا ۱۹۶۸ء کا اور تیسرا ۱۹۷۱ء کا۔ کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان قوانین میں آخری دو قانونوں کو منسوخ کر دیا جائے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان قوانین کا ہندوستانی اور انگلوانڈین اخبارات کے لئے یکساں استعمال نہیں کیا گیا۔

حکومت نے جو کمیٹیاں مقرر کی تھیں ان کی سفارش کی روشنی میں مرکزی اسمبلی نے ۱۹۷۲ء میں تقریباً دو درجن قوانین منسوخ کر دئے۔ ان میں پریس کے متعلق بھی وہ دونوں قوانین شامل تھے جن کی کمیٹی نے سفارش کی تھی۔

۱۹۷۲ء میں کانگریس کے اندر ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو داخلہ کونسل کا حامی تھا۔ اس جماعت کے لیڈر مسٹر سی، آر، داس اور موتی لال نہرو تھے۔ مسٹر داس، گیا کانگریس کے صدر تھے، جب کانگریس کے اجلاس میں یہ تجویز انھوں نے پیش کی تو بہت بڑی اکثریت نے اس کی مخالفت کی اور یہ تحریک مسترد ہو گئی۔ مسٹر داس نے کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دیا اور اُسی دن ”سواراج پارٹی“ کی بنا ڈالی۔ جلد ہی اُن کو اپنی کوششوں میں کامیابی ہوئی اور کانگریس کو بھی اُنکے مطالبے کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس جماعت نے اپنے نقطہ خیال کی نمایندگی کے سلسلہ میں اخبار کی ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی، چنانچہ ”ہندوستان ٹائمز“ نے جلد ہی اس کمی کو پورا کر دیا۔ آج بھی یہ اخبار کانگریس کے داپنے بازو کے نقطہ خیال کا نمایندہ ہے۔

ہندوستانی رائے عامہ کے ارتقاء نے جلد ہی لوگوں کو ہندوستانی خبر رساں ایجنسی کی ضرورت کی طرف بھی متوجہ کیا ملک میں اسوشیٹڈ پریس موجود تھا مگر اُس کا بڑی حد تک حکومت سے تعلق تھا، اس لئے قوم پرور طبقہ کو اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اس شکل پر قابو حاصل کرنے کے لئے ۱۹۷۷ء میں فری پریس (Free Press) کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے روح رواں مسٹر جیکر، ڈاکٹر بیسٹ جی، ڈی برلا اور مسٹر وال چند مہیرا چند وغیرہ تھے۔ اس خبر رساں ایجنسی نے بہت جلد ترقی کی اور اُسی سرعت کے ساتھ زوال پذیر بھی ہوئی۔ ۱۹۷۷ء میں ہندوستان کے علاوہ اور دوسرے ملکوں کی خبریں بھی اُس نے فراہم کرنا شروع کر دی تھیں اور اس سلسلہ میں اُس کا ایک دفتر لندن میں قائم تھا۔ لیکن ۱۹۷۷ء میں اُس کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۳۳ء میں ایک دوسری خبر رساں اجنسی یونائیٹڈ پریس کے نام سے بنگال میں قائم ہوئی۔ یہ خالصاً کانگریس کے خیال کی نمایندگی کرتی ہے۔ ابتداء میں تو اس کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی مگر کانگریس وزارتوں کے عہد میں اس نے کچھ ترقی کی ہے۔

لارڈ دارون کا دور حکومت بڑا ہی ہنگامہ خیز تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی نے ۱۹۳۰ء میں نمک سازی کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے (Ordinance) کا نفاذ شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر پریس بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ پریس آرڈیننس (Indian Press Ordinance ۱۹۳۰) کے نام سے ایک قانون نافذ ہوا۔ اس قانون میں ان تمام قوانین کا پچوڑا موجود تھا جو منسوخ ہوئے تھے اور اس سلسلہ میں بہت سے ہندوستانی اخبارات سے ضمانتیں طلب کی گئیں۔

موجودہ جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی حکومت نے ڈفنس آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ ضروری سمجھا۔ اور اس کے ساتھ ہی پریس کی آزادی بڑی حد تک قطعاً ختم ہو گئی۔ ابتداء میں تو حکومت اور اخبارات کے تعلقات بوجہ خراب ہو گئے تھے۔ لیکن بعد میں "آل انڈیا نیوز پیپرز اسیوشن" (All India Newspapers Association) قائم ہوئی۔ اور دہلی میں تمام ملک کے ایڈیٹروں کی ایک کانفرنس قائم ہوئی۔ حکومت نے اس کے بعد اخبارات کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی بنائی اور اس کی شانیں صوبوں کی حکومتوں نے بھی قائم کیں اور یہ طے پایا کہ حکومت کسی اخبار کے خلاف بلا اس مشاورتی کمیٹی سے مشورہ کئے ہوئے کوئی قدم نہ اٹھائے۔

ذیل میں ان قابل ذکر اخبارات کی فہرست پیش کی جاتی ہے جو اس وقت موجود ہیں:

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت	نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
نیشنل ہیرالڈ	انگریزی	لکھنؤ	روزنامہ	ڈیلی ہیرالڈ	"	لاہور	روزنامہ
پانیر	"	"	"	سندھ ٹائمز	"	"	ہفتہ وار
لیڈر	"	الہ آباد	"	نیو ٹائمز	"	"	"
اسٹار	"	"	سہ روزہ	ایسٹرن ٹائمز	"	"	"
ہندوستان ٹائمز	"	دہلی	روزنامہ	منڈے مارنگ	"	"	"
نیشنل کال	"	"	"	ڈیلی گزٹ	"	کراچی	روزنامہ
اسٹیمین	"	"	"	کراچی ڈیلی	"	"	"
یونائیٹڈ انڈیا اینڈ اسٹیس	"	"	سہ روزہ	سندھ آبزرور	"	"	"
کامرس اینڈ انڈسٹری	"	"	ہفتہ وار	خیبر میل	"	پشاور	ہفتہ وار
سول اینڈ ملٹری گزٹ	"	لاہور	روزنامہ	ممبئی کرانیکل	"	ممبئی	روزنامہ ہفتہ وار
ٹریبیون	"	"	"	ٹائمز آف انڈیا	"	"	روزنامہ

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت	نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
اسٹار	انگریزی	ممبئی	روزنامہ	انڈین نیشن	انگریزی	پٹنہ	روزنامہ
اوٹنگ نیوز آف انڈیا	"	"	"	سرج لائٹ	"	"	"
ممبئی سنڈے نیل	"	"	"	نیواڑیہ	"	کلکتہ	"
کامرس	"	"	ہفتہ وار	آبزرور	"	"	ہفتہ وار
فائینانشل نیوز	"	"	"	حقیقت	اردو	لکھنؤ	روزنامہ
السٹریٹریکلی آف انڈیا	"	"	"	ہمد	"	"	"
انڈین سوشل رفارمر	"	"	"	حق	"	"	"
ریکلی نیوز آف انڈیا	"	"	"	ہندوستان	"	"	ہفتہ وار
ڈیلی نیوز	"	ناگپور	روزنامہ	مدینہ	"	بجنور	سہ روزہ
ہتواڈا	"	"	سہ روزہ	یتج	"	دہلی	روزنامہ ہفتہ وار
انڈیپنڈنٹ	"	"	ہفتہ وار	وحدت	"	"	"
ہندو	"	مدراں	روزنامہ	سواراج	"	"	"
انڈین ایکسپرس	"	"	"	وطن	"	"	"
رائس میل	"	"	"	ریاست	"	"	ہفتہ وار
بسٹ	"	"	ہفتہ وار	منادی	"	"	"
ڈیلی پوسٹ	"	بنگلور	روزنامہ	دین دنیا	"	"	"
اسٹیشنرین	"	کلکتہ	"	الامان	"	"	سہ روزہ
سٹار آف انڈیا	"	"	"	الجمعیۃ	"	"	"
ہندوستان اسٹینڈرڈ	"	"	"	انقلاب	"	لاہور	روزنامہ
اڈوانس	"	"	"	احسان	"	"	"
امرت بازار پترکا	"	"	"	زمیندار	"	"	"
کیپٹل	"	"	ہفتہ وار	ملاپ	"	"	"
انڈین اکنامسٹ	"	"	"	پر تاب	"	"	"
اورینٹ	"	"	"	ہندو	"	"	"
سلاہٹ کرائیکل	"	سلاہٹ	"	زمزم	"	"	"
ٹائمز آف آسام	"	"	"	کرم نیر	"	"	ہفتہ وار

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت	نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
شکار پور گزٹ	سندھی	شکار پور	ہفتہ وار	دشوا متر	ہندی	ککلتہ	روزنامہ
فرنیٹر ایڈوکیٹ	اردو	پشاور	روزنامہ	نوا شکتی	"	پٹنہ	روزنامہ ہفتہ وار
اصلاح سرحد	"	"	ہفتہ وار	جننا	"	"	روزنامہ
مجاہد	"	"	"	یوگی	"	"	ہفتہ وار
ترجمان سرحد	"	"	"	کرم دیر	"	صوبہ متوسط	"
وجیہ پر بھات	"	"	روزنامہ	سواراجیہ	"	"	"
سرحد	"	"	"	ہندوستان	"	دہلی	روزنامہ
اجمل	"	"	بہی	دیر ارجن	"	"	"
خلافت	"	"	"	ہندو	"	"	ہفتہ وار
قوم	"	"	ہفتہ وار	الواحد	سندھی	سندھ	روزنامہ
ہند جدید	"	"	ککلتہ	روزنامہ ہفتہ وار	"	"	"
عصر جدید	"	"	"	ہندو سماج	"	"	ہفتہ وار
مسلم	"	"	پٹنہ	قربانی	"	"	"
اتحاد	"	"	"	دھرم دیر	انگلونڈھی	"	"
نقیب	"	"	ہفتہ وار	سندھ سدھار	"	"	"
جیون	"	"	"	ستارہ ہند	"	"	"
البربان	"	"	ناگپور	سندھ زمیندار	"	"	سہ روزہ
الفاروق	"	"	"	پارسی سنسار لوک سیوت	انگلونڈھی	"	"
نظام	"	"	سندھ	اکالی پتر کا	گورکھی	پنجاب	ہفتہ وار
آج	ہندی	بنارس	روزنامہ	فتح	"	"	"
پر تاب	"	کانپور	"	خالصہ سیوک	"	"	"
بھارت	"	"	"	موجی	"	"	"
نواجیوتی	"	اجمیر	ہفتہ وار	فرنیٹر ایڈوکیٹ	پشتو	پشاور	روزنامہ ہفتہ وار
راجستان	"	"	"	سرحد	"	"	ہفتہ وار
شکر شش	"	لکھنؤ	"	آشا	اڑیا	اڑیسہ	روزنامہ
لوکومانیہ	"	ککلتہ	روزنامہ	دیش کتہ	"	"	"

نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت	نام اخبار	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
سماج	اُڑیا	اڈیسہ	روزنامہ ہفتہ وار	یو دایا	مرہٹی	صوبہ متوسط	ہفتہ وار
شکتی	"	"	ہفتہ وار	کیسری	"	ممبئی	سہ روزہ
لوک ماتا	"	"	"	ناواکال	"	"	"
آمنٹا وکٹان	تامل	مدرا س	"	لوکا شکتی	"	"	روزنامہ
دارالسلام	"	"	سہ روزہ	لوکو مانیہ	"	"	روزنامہ ہفتہ وار
جدید دلچسپ	"	"	ہفتہ وار	دنین پرکاش	"	"	روزنامہ
کودی اراٹسو	"	"	"	پھول حبیب	"	"	ہفتہ وار
کمالان	"	"	"	شری ونگیشور	"	"	"
جے بھارتی	"	"	روزنامہ	تارن بھارت	"	"	"
دھنیامانی	"	"	"	دیودہ ورکھا	"	"	"
تامل مان	"	"	"	تری کال	"	"	"
وڈو تھالی	"	"	"	پرکاش	"	"	"
اندھرا پترکا	تملگو	"	روزنامہ ہفتہ وار	محبہ کامگار	"	"	"
جنوانی	"	"	"	جنتا	"	"	"
اندھرا رتنا	"	"	سہ روزہ	دھائن دھاری	"	"	"
کٹانا پترکا	"	"	ہفتہ وار	اوبان	"	"	"
پر جا بندھو	"	"	"	سانج ورتمان	"	"	"
پر جامتر	"	"	"	ممبئی سماچار	گجراتی	"	روزنامہ ہفتہ وار
تری لنگا	"	"	"	دیش مٹر	"	"	"
دھینی	"	"	"	گجرات سماچار	"	"	"
زمین رعیت	"	"	"	گجرات	"	"	"
کانٹی ریوہ	کرائی	"	سہ روزہ	ہندوستان پر جامتر	"	"	"
پر بھات	"	"	ہفتہ وار	انصاف	"	"	"
سو تترہ	"	"	"	جنم بھومی	"	"	"
ماتر بھومی	ملیالم	"	"	لوک مات	"	"	"
ہمارا شٹرا	مرہٹی	صوبہ متوسط	"	پر تاب	"	"	ہفتہ وار

نام اجناس	زبان	مقام اشاعت	کیفیت	نام اجناس	زبان	مقام اشاعت	کیفیت
پر جامتر کساری	گجراتی	ممبئی	ہفتہ وار	کیساری	بنگالی	ممبئی	روزنامہ ہفتہ وار
نیویر کاشس	"	"	"	پنچانیہ	"	"	"
مسلم گجراتی	"	"	"	دیش	"	"	"
مزدور سندیش	"	"	"	حنفی	"	"	"
قوم سیوک	"	"	"	محمدی	"	"	"
گجراتی	"	"	"	نوا شکتی	"	"	"
گجرات متر	انگلو گجراتی	"	"	سنگیوانی	"	"	"
گجرات دپن	"	"	"	سوادش	"	"	ہفتہ وار
گجرات پنچ	"	"	"	نیجاہت	"	"	"
جام جمشید	"	"	"	سنگا ٹھور	"	"	"
قیصر ہند	"	"	"	جنا شکتی	"	"	"
انند بازار پتر کا	بنگالی	"	"	جگا بھیری	"	"	"
آزاد	"	"	"	جگا شکتی	"	"	"
بندے ماترم	"	"	"	باتوری	آسامی	"	روزنامہ
بنگ باسی	"	"	"	آسامیہ	"	"	ہفتہ وار
باسومتی	"	"	"	دیکا آسوم	"	"	"
تہوادی	"	"	"	پریتبا	انگلو آسامی	"	"
اسما عیسیٰ	انگلو گجراتی	"	"	روزنامہ	"	"	"

محمد عتیق صدیقی

تذکرہ معرکہ سخن

اپنے رنگ کا بالکل پہلا تذکرہ جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ کے کلام پر کیا کیا اعتراض کئے اور یہ کہ ان کا کوئی جواب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ تذکرہ انتہائی کاوش کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور فن شعر کے متعلق بے بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ آٹھ آنہ (۸)۔

مینجر نگار - لکھنؤ

نگاہ بازگشت

(مسل)

۱۴۔ حسرت موہانی حضرت حسرت موہانی ملک کے مشہور شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ حضرت تسلیم کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ آپ کا رنگ سخن ہمیں داغ و جلال و امیر کا زمانہ شاعری یاد دلاتا ہے۔ آپ کی شاعری میں تقلید کے عنصر کی فراوانی اور پامال و فرسودہ مضامین کی بہتات ہے۔ آپ کے کلام کی بنیاد بجائے جذبات کے زیادہ تر تخیل پر ہے۔ اور آپ کے اشعار لکھنوی رنگ شاعری کا نمونہ۔ آپ کے کلام میں حقیقی جذبات اور جدائی حسیات کی کمی اور اشعار میں زیادہ تر محبوب کے خارجی اوصاف کی تعریف ہے آپ کے کلام میں فکر و خیال کی بلندی و تنوع کم اور روایتی تغزل کے مضامین کی کثرت ہے۔ اس کے علاوہ اشعار میں نہ سوز و گداز ہے اور نہ اثر آفرینی۔ اُنکے یہاں زندگی پر نہ کوئی تنقیدی نظر ہے اور نہ حیات و کائنات کا مشاہدہ و مطالعہ۔ ان کی شاعری نہ نفسیات انسانی کا تجزیہ ہے اور نہ حقیقی جذبات و احساسات کا پرتو۔ بلکہ ان کی شاعری میں روایتی شاعری کی بنا پر وہی محبوب کی عشوہ طرازیں اور ستمکاریاں ہیں اور وہی لکھنوی رنگ تغزل کی داستان پارینہ جن کو الفاظ کا ایک نیا لباس دیکر پیش کیا گیا ہے ملاحظہ ہو:-

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا	طرفہ عالم ہے ترے حُسن کی بیداری کا
اس سلیقے سے کیا ذبح کہ دامن اُن کا	خون عشاق سے گلزار نہ ہونے پایا
نوٹ لے جی بھر کے حسرت لذت آزار عشق	اُس ستمگر کا یہ رنگ آشنائی پھر کہاں
بیل شوق مجھے پاس کے وہ بولے ہنسکر	دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو
فاتحہ پڑھنے چلے مرقد حسرت پہ جو وہ	پہلے کس ناز سے رورو کے سنوارے گیسو
محتاج بولے عطر نہ تھا جسم خوب یار	خوشبوئے دلبری تھی جو اُس پیرہن میں تھی
کبھی چرا کے جو وزن سے بھی تجھے دیکھوں	تو چور کی جو سزا ہو وہی سزا میری
پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے	مشتاق دید اور بھی للچا کے رہ گئے

ان تمام اشعار کو دیکھنے کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ ان اشعار میں جذبات کی پاکیزگی ہے نہ بلندی۔ نہ معنی آفرینی ہے نہ علوئے تخیل۔ اسی لحاظ سے الفاظ میں بھی متانت کم اور عمومیت زیادہ ہے۔ ظاہری کلام کی نفاست خود جذبات و تخیل کی پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے۔ شاعر کے الفاظ

میں اثر اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر کتاب میں پڑھی ہوئی یا سُنی سنائی باتوں کے بجائے اپنی زندگی کی حقیقی واردات کا اظہار کرے۔ اگر اُس میں خلوص نہیں ہے تو وہ محاوروں کا کیسا ہی برمحل استعمال کیوں نہ کرے اُس کی آواز کھوکھلی مصنوعی اور بے اثر رہے گی۔ اور پھر اس قسم کے اشعار سُنتے سُنتے تو اب طبیعت بھی بھر چکی ہے اور ان میں اب کوئی دلکشی باقی نہیں ہے۔

ہمیں جناب حسرت کے یہاں توانی تشبیہات کی مثالیں تو نہیں البتہ خارجی شاعری کے نمونے زیادہ ملتے ہیں اور اگر جذباتی و داخلی شاعری کے کہیں کہیں اشعار پائے بھی جاتے ہیں تو ان میں سے بہت سے اشعار پاکیزگی و متانت سے گرے ہوئے ہیں اور سطحی خیالات و جذبات کا نمونہ ہیں۔ جیسے:-

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
تصور میں وہ شوخ تھا ہم سے باہم
دعوت میں تری میں بھی ہوں معلوم ہو لیکن
ہمیں کھلتی مری نسبت تری اسے حیلہ جو مرضی
برسر ناز وہ از راہ کرم پہونچا تھا
ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا
(لفظ کام کی معنویت یہاں ذرا داد طلب ہے)

امید وار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
دل کچھ اس ڈھب سے لئے اسنے کہ برسوں کوئی
تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے
حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پا یا

ان سب اشعار میں اور خصوصاً آخر کے دو شعروں میں جناب حسرت نے اپنے محبوب کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جو معیار مقرر کیا ہے وہ اہل ذوق حضرات کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جناب حسرت ایک مشاق شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی کہنہ مشقگی کی بدولت کہیں کہیں محالہ بڑی کے اچھے اشعار نکال لئے ہیں اور جو فنی اعتبار سے بے عیب بھی ہیں لیکن ان کی تخلیق جمال کی کوشش میں کسی قسم کی بلندی اور عظمت نہیں پائی جاتی۔ ان کی شاعری زندگی سے بہت دور ہے اور اس لئے مصنوعی ہے اور یہ فرسودگی بیان اس دور جدید میں نہ لایق ستائش ہے نہ قابل توجہ۔ اور اگر میں یہاں یہ کہوں تو شاید نامناسب نہ ہوگا کہ:-

طرح نوافلن کہ ماجدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانہ امروز فردا ساختی

لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ جناب حسرت کے یہاں تغزل کی عمدہ مثالیں نہیں ملتی۔ آپ کے یہاں تغزل کا صحیح رنگ موجود ہے مگر کم۔ اور وہ بھی سب روایتی و تقلیدی عناصر کی بنیادوں پر۔ چنانچہ آپ کے اچھے اشعار کے نمونے ملاحظہ ہوں:-

حسرتی بے پردا کو خود دین و خود آرا کر دیا
ایک ہی بار ہوئیں وہمہ گرفتار ہی دل
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا
التفات انکی نگاہوں نے دوبار نہ کیا

اک برق تیاں ہے کہ تکلم ہے تمھارا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
آئی جو اُن کی یاد مراد دل ٹھہر گیا
ہے انتہائے یاس بھی اک بتلائے شوق
آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حُسن،
اک رنگِ لطفات بھی اس بے رُخی میں تھا
گو ان اشعار کے بعض مضامین فرسودہ ہیں مگر جناب حسرت کی مشاطی اور اُن کے اندازِ بیان نے ان میں
ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ان اشعار کا طرزِ ادا اور ندرتِ بیان یقیناً قابلِ ستائش ہے۔
یہ اور اسی قسم کے اشعار حضرت حسرت کی مشاطی کا ثبوت ہیں اور ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ کے
بعض اشعار میں فارسیت کا بے محل استعمال شعر کو بے کیف کر دیتا ہے۔ جیسے:

وہ قامت بلند نہیں درقبائے ناز
اک طرفہ ماجرا ہے در کوئے میفروشاں
اک سروِ ناز ہے جو بنا ہو برائے ناز
سرگرم بادہ نوشی انہوہ خرقہ پوشاں
’درقبائے ناز‘ اور ’در کوئے میفروشاں‘ میں یہ لفظ ’در‘ لباسِ شعر میں ایک پیوند کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت
غیر مانوس معلوم ہوتا ہے۔

جناب حسرت نے بعض جگہ نامناسب تصرفات سے کام لیا ہے مثلاً یہ شعر:-
خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں
دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
یہ لفظ ”یاریاں“ بھی صحیح مذاقِ شعری کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اور کچھ بہلا نہیں معلوم ہوتا۔
جناب حسرت کے یہاں بعض اشعار میں مناسب الفاظ کو چھوڑ کر ضرورتِ شعری یا کسی اور وجہ سے اُنکی
جگہ دوسرے نامناسب اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال شعر کے لطف کو زائل کر دیتا ہے۔ جیسے ”آسودگی“
کے بجائے غول کے لئے ایک غیر مانوس اور ثقیل لفظ ”فراغت“ بکثرت استعمال کیا ہے اور اس مختصر انتخاب
میں ہمیں یہ لفظ تین جگہ نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
اس میں اک شانِ فراغت بھی ہجراحت کے سوا
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی
وہ جو یک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا
عہدِ یک عمر فراغت سے بھی خوشتر گزرا
ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

سب کی خاطر کا ہے خیال تمھیں
کچھ ہمارا بھی انتظام کرو

اس لفظ ”انتظام“ کا استعمال یہاں کہاں تک موزوں ہے وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس قسم کی مثالیں

جناب حسرت کے کلام میں اور بھی اکثر پیشتر پائی جاتی ہیں۔

۱۵۔ حفیظ جالندھری

جناب حفیظ جالندھری، پنجاب کے مشہور نظم گو شاعر ہیں مگر آپ کا انتخاب کلام، دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ غزل بھی خوب کہتے ہیں۔ آپ کا فطری رجمان غزل ہی کی طرف ہے۔ آپ کی غزلوں میں وہ لوح - شیرینی اور سُرلاپن موجود ہے جو تغزل کے لئے مخصوص ہے۔ آپ کی زندگی بھی عسرت اور فَلَاکت میں بسر ہوئی ہے اور آپ کو اپنے دورانِ حیات میں مختلف قسم کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر آپ نے اپنے اشعار میں زمانے کی شکایت نہیں کی اور اگر انھوں نے ہمیں شکوے کے لئے اپنے لب کھولے بھی ہیں تو احسان کی طرح آگ نہیں برسائی ہے بلکہ اُس میں بھی غزل کا مانوس انداز اور لب و لہجہ کا دھماپن موجود ہے۔ جیسے:-

دوستوں کی بے وفائی پر حفیظ صبر کرنا بھی مجھے آجائے گا

مجھ کو ان مجبور یوں پر بھی ہے اتنا اختیار آہ بھرتیا ہوں میں فریاد کر لیتا ہوں میں

آپ کے اشعار میں سوز و گداز اور درد و اثر کے ساتھ ساتھ تخیل بلند اور مدرت مضامین کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ معمولی سی بات کو اس اسلوب کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ شعر میں ایک قسم کی عذرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ جیسے:

اٹھار کھا ہے میں نے آپ کا دیدار محشر پر مرا منہ تک رہے ہیں میری ہمت دیکھنے والے

صرف شعر کے طرز ادا اور لہجہ نے شعر میں کس قدر قوت پیدا کر دی ہے۔

اسلوب بیان کی چند اور عمدہ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

وہ اور ہمارے پاس خدا ساز بات تھی ہم مدتوں خدا کی قسم بدگماں رہے

ہمت بلند تھی مگر اُفتاد دیکھنا چپ چاپ آج خود دعا ہو گیا ہوں میں

مری مجبوریاں کیا پلوں چھتے ہو کہ جینے کے لئے مجبور ہوں میں

ابھی باقی ہے میعادِ مصیبت ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

آخری شعر طرز ادا اور انداز بیان کے علاوہ سوز و گداز کا مرقع ہے اور نہایت پراثر۔ جینے کی تمنا صرف اس لئے کہ ابھی کچھ اور مصیبتیں نازل ہونے والی ہیں اور اُن کو سہنا ہے نہ صرف شاعر کے سوز و گداز اور حسرت کی انتہائی منزل کی طرف اشارہ کر رہا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ شاعر کی علوئے ہمت اور ضبط و تحمل کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ ایک صریح طنز کی مثال ملاحظہ ہو:-

تمام زاد سفر راستے میں لٹ جاتا خدا نے فضل کیا کوئی رہنما نہ ملا

لفظ ”رہنما“ رکھ کر جو طنز پیدا کیا ہے وہ نہایت پُر لطف ہے۔ بعض بعض شعر آپ کے بہت سادہ مگر نہایت پُر کیف

سہ مقالہ نگار نے حسرت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بے بغیر کسی ضنن و اضافہ کے بحسنہ شایع کر دیا ہے، کیونکہ حسرت کی شاعری کے علاوہ جو کچھ کہا

جاسکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے اور اس ”سب“ کے جواب میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ ”سخن شناس نئی دلبرِ خطا اینجاست“

حسرت کے تغزل سے لطف اٹھانے کے لئے جس ذوق کی ضرورت ہے وہ یقیناً اتنا عام نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہئے۔ میرے کہیں

بھی بعض حضرات کو سوائے تحزیب اخلاق کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

ہیں۔ جیسے ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
بھلائی نہیں جاسکیں گی وہ باتیں
تم نے دنیا ہی بدل ڈالی مری
حشر کے دن میری چپ کا ماجرا
پھر وہ آرزوں میں اک روح بھونکدی
جوش بیان اور معنی آفرینی کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں:-

تہنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں
نا آشنا میں رتبہ دیوانگی سے دوست
وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
ندرت فکر اور تخیل بلند کے نمونے بھی آپ کی شاعری میں پائے جاتے ہیں:-

بندی پر اٹھائیں تھیں نگاہیں
حسن بھی اب تو ٹھہرتا نہیں معیار نظر
مگر آپ کے کلام میں ابھی نچنگی کی شان پیدا نہیں ہوئی ہے اور کہیں کہیں خامیاں بھی ہیں۔ جیسے آپ کا ایک شعر ہے:-
او مبتلائے زلیست ٹھہر خود کشی نہ کر
صرف "مبتلائے زلیست" کی ترکیب سے کسی مفہوم کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں "مبتلائے غم زلیست" یا "مبتلائے آلام زلیست" وغیرہ کوئی ترکیب ہوتی تو کوئی مفہوم پیدا ہو سکتا تھا۔

تھے حق شناس اور انا حق نہ کہہ سکے
"ہم بھی زبان رکھتے تھے" کے مفہوم میں جناب حفیظ نے "اہل زبان" کا ٹکڑا صرف کیا ہے جو میرے خیال میں فصیح نہیں
اور "اہل زبان" کہنے سے سامع کا ذہن اصل مفہوم کی طرف منتقل ہونے کے بجائے "اہل زبان" کے اصطلاحی معنی کی
طرف منتقل ہوتا ہے۔ اگر دوسرے مصرعہ کو یوں نظم کرتے تو مفہوم بہت زیادہ واضح ہو جاتا اور "اہل زبان" کا ٹکڑا بھی نکلتا
کہ ۴ "گو تھی زبان منہ میں گربے زبان رہے"

فرش سے مطمئن نہیں۔ پست ہے ناپسند ہے
"پست ہے ناپسند ہے" نے شعر کے مفہوم کو بہت مبہم کر دیا ہے۔ اگر پہلے مصرعہ کا مفہوم یوں قرار دیا جائے کہ
فرش سے مطمئن نہیں اس لئے کہ پست ہے۔ تو "نا پسند ہے" کا ٹکڑا بیکار ہوا جاتا ہے کہ "مطمئن نہیں" پہلے ہی صرف
ہو چکا ہے۔ اور اگر دونوں ٹکڑوں کو الگ کر کے پڑھا جائے کہ فرش سے مطمئن نہیں۔ اور پست ہے ناپسند ہے (حالانکہ
دونوں ایک ہی چیز ہیں) تو پھر بھی پست کے بعد کا "ہے" زائد ہوا جاتا ہے۔ خدا معلوم فرش سے مطمئن نہیں کہنے کے بعد
پست ہے ناپسند ہے سے کیا مفہوم پیدا کیا ہے؟

۱۔ اعتراض غلط ہے، شاعر نے "مبتلائے زلیست" کہہ کر یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ "زلیست" بجائے خود ایک غم ہے۔ جو شعر کا حسن ہی، وہی آپ کے نزدیک قبح ہے! نیاز

۱۶- دل۔ شاہجہاں پوری حضرت دل شاہجہاں پوری جناب امیر مینائی مرحوم کے شاگرد ہیں اور اسوقت ملک کے مشاق شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کا مذاق پاکیزہ اور طبیعت متین ہے۔

آپ کا رنگ سخن اُس شوخی و رندانہ بانگین سے معرا ہے جو داغی اسکول کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ اُن کا کلام یکسر بے کیفیت و بے لطف ہے۔ جناب دل کے کلام میں وہی دلکشی و رعنائی پائی جاتی ہے جو ایک صحیح رنگ تغزل میں ہونا چاہئے۔ آپ کے کلام میں جذبات کی وہ فراوانی نہیں ہے جو موجودہ دور میں ہمیں حضرت جگر کے یہاں نظر آتی ہے مگر پھر بھی غنائے تغزل کی مثالیں آپ کے یہاں موجود ہیں جو بے کیفیت بھی ہیں اور پراثر بھی۔ آپ کی شاعری یکسر بین و مرثیہ بھی نہیں ہرچند کہ سوز و گداز سے آپ کا کلام خالی نہیں ہے۔ آپ ایک حقیقی شاعر ہیں اور اپنے جذبات و آثار کو نہایت مناسب و موزوں الفاظ میں ادا کرنا جانتے ہیں۔ گو تقلید کا عنصر بھی ہمیں کہیں کہیں آپ کے یہاں نظر آتا ہے

جیسے: بڑھے جوش جنوں میں دست و حشت جس قدر چاہے قیامت کی ہے گنجائش مرے چاک گریباں میں
دیکھئے کب ختم ہو شوقِ نظر کا امتحان بڑھ گیا نازِ تجلی مجھ کو خیراں دیکھ کر

عاشق کی چاک گریبانی اور حیرانی اب اتنی پرانی چیز ہو چکی ہے کہ اس میں اب کوئی دلکشی باقی نہیں رہی۔ مگر اس قسم کی مثالیں ہمیں جناب دل کے کلام میں بہت ہی کم نظر آتی ہیں۔ زیادہ تر وہ اپنی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اُن کے اندازِ بیان اور طرزِ ادا میں بھی ایک خاص قسم کی ندرت ہوتی ہے جس سے بعض اوقات پامال مضمون بھی نیا ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

ایک نہایت فرسودہ مضمون ہے کہ نظارہ جمال اکثر و بیشتر باعثِ بخود می و مدہوشی ہوتا ہے مگر جناب دل کی جدت پسند طبیعت اس مضمون کو کس قدر نئے انداز سے نظم کرتی ہے کہ:

محو جمال بخود و مخمور ہو گئے یعنی قریب ہو کے بہت دور ہو گئے
ایک اور عام مضمون کو کہ عاشق جب تک محبوب سامنے نہ ہو، کیا کیا سوچتا ہے اور اُس سے شکایت کے لئے کیا کیا اندازِ بیان تلاش کرتا ہے۔ مگر اس کا سامنا ہوتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یوں بیان کرتے ہیں:-

دفعۃً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
پہلے مصرعہ کی میساختگی اور خلوص کی شدت قابلِ داد ہے۔

اپنے دردِ دل کی کیفیات کو تقریباً ہر شاعر نے پر زور الفاظ میں بیان کیا ہے مگر جناب دل کا اندازِ بیان دیکھئے کہ کس قدر سادگی سے اپنی حالت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

آغازِ تمنا سے انجامِ محبت تک گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا
کس قدر پراثر ترجمانی کی ہے۔ اس شعر میں خدا معلوم کیوں میں خود اس تصرف کا مرکب ہوں اور اس کو اسی طرح پڑھتا ہوں کہ:

آغازِ محبت سے انجامِ محبت تک گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا
جناب دل کے کلام میں تعبیرِ شاعرانہ کی مثالیں اکثر پائی جاتی ہیں۔ ایک جگہ دامن جھٹکنے کے انداز کو یوں

بیان کرتے ہیں کہ:

سرطور ایک برق حسن لہراتی نظر آئی
اسی انداز کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

یاد ہے۔ ہاں یاد ہے طرز نگاہ مست یار
آپ کے بعض اشعار میں مومن کے طرز ادا کا لطف آتا ہے۔ جیسے:

نگاہ مست سے اوڑھنے والے
ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں

تجھے تو ہے مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی
ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں،

سادگی بیان اور محاکاتی رنگ کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:-

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے
جنا ب دل کے یہاں صحیح رنگ تغزل کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شب وعدہ
نگاہ شوق رہی ہجرانِ دل لیکن

اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں
کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے

اس اضطراب پہ قربان اک جہان سکوں
کیا کہئے اب آلِ محبت کی سرگزشت

کوئی سنبھال رہا ہے تڑپ رہا ہوں میں
یاد اس کی رہی ہے مگر دل نہیں رہا

غماز کہوں یہ سوئے اب۔ سفاک کہوں یہ ناممکن
اے اہل نظر میں کیا سمجھوں آگاہ نہیں مستقبل سے

نشائے نظر جو کچھ بھی ہو انداز تو معصومانہ ہے
انجام محبت کیا ہوگا۔ آغاز ہی اک افسانہ ہے

جنا ب دل کے کلام میں سوز و گداز اور اثر آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ جیسے:-

منظرِ اداس۔ شمع سحر پیکرِ خموش
ادھر گھبرا کے غمخواروں کی مایوسانہ سرگوشی

اُٹھا ہے کوئی گرمی محفل لئے ہوئے
ادھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بخیر ہونا

ایسے جوشِ الم۔ کب تک گریہ۔ دل آج تو ڈوبا جاتا ہے
بہارِ جام بکف جھومتی ہوئی آئی

موجیں ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں۔ طوفاں ہوا اُٹھاتا ہے
شکستِ عہد نہ کرتے تو اور کیا کرتے

بے تکلف ہر کلی کو مسکرا نا ہی پڑا
بعض بعض جگہ آپ کے کلام میں جوش و خروش کا عنصر بھی ملتا ہے۔ مثلاً:-

اسی سے کیجئے رفتار کا کچھ اندازہ
نظامِ دہر بدلتا ہوا اُٹھا ہوں میں

شعر کے تیور اور لہجہ کا تیکھا پن قابل ملاحظہ ہے۔

غرض جناب دل کے کلام میں تختیبل بلند ندرت بیان اور تعبیر شاعرانہ کی مثالیں بہت پائی جاتی ہیں۔ آپ بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے نہایت مناسب و موزوں الفاظ صرف

کرتے ہیں۔ معاملات حسن و عشق کے بیان میں بہت حزم و احتیاط سے کام لیتے اور عامیانہ یا عریاں انداز بیان اختیار نہیں کرتے۔ اس شدید حزم و احتیاط ہی کا شاید نتیجہ ہے کہ آپ کے یہاں جوش و ولولہ کی کمی ہے۔ بہر حال جہاں تک محسوسات و ادائے بیان کا تعلق ہے۔ آپ ایک نہایت کامیاب شاعر کہے جاسکتے ہیں۔

۱۷۔ روش صدیقی حضرت روش صدیقی ایک نو عمر نظم گو شاعر ہیں۔ مگر آپ کی شاعری کی ابتداء غزلوں سے ہوئی اور جس کا انتخاب اس وقت زیر نظر ہے۔ اس انتخاب کے دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا فطری میلان نظم ہی کی طرف ہے۔ آپ اپنی غزلوں میں مختلف قسم کی تراکیب فارسی اور نظم کی رنگینوں کو راہ دیتے ہیں۔ جیسے یہ شعر:-

وہ لب کھلیں تو بکھر جائیں نغمہ ہائے ارم وہ آنکھ اٹھے تو برس جائے کیف میخانہ
کسی نظم کا شعر معلوم ہوتا ہے۔ وہ فارسی تراکیب جو آپ کے یہاں استعمال ہوتی ہیں ان میں سے چند نمونے ملاحظہ ہوں
بعید جلوہ ہائے رنگ و بو۔ راز تشنہ کامی شوق۔ جنبش دامن تصور۔ شمع احساس جدائی۔ گریہ نیم شبی۔ رفتہ سوزِ
نا تمام۔ فغانِ روح بتیابی انجمن نیم شبی وغیرہ وغیرہ۔

بعض بعض اشعار میں اس قدر استعارات سے کام لیا گیا ہے کہ شعر میں تکلف پیدا ہو گیا ہے اور یہ بھی نتیجہ ہے
آپ کے میلان نظم کوئی کا۔ جیسے :-

کبھی اے جنبشِ دامن تصور تجھ سے شمع احساسِ جدائی کو بجھایا نہ گیا
صرف اتنا کہنا تھا کہ اے تصور محبوب! تجھ سے بھی احساسِ جدائی کو کم نہ کیا گیا۔ اُس کو ایسا انداز بیان عطا کیا ہے کہ شعر
میں تصنع اور آورد کی جھلک محسوس ہونے لگتی ہے اور بے ساختگی و آند زائل ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی تراکیب صرف
نظم میں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کا ایک شعر ہے :-

کسی کا لطف پنہاں آنسوؤں میں مسکراتا ہے مری ناشاد دمانی انتہائے شادمانی ہے
”لطف“ ایک کیفیت کا نام ہے۔ اُس کا ہنسنا یا رونما معلوم۔ لطف کا آنسوؤں میں مسکراتا بہت مبہم سی بات ہو
ترے مذاق نے کیا کیا دکھائے ہیں عالم ترا مذاق ہی اے کاش جاوداں ہوتا
اس شعر کے پہلے مصرعہ میں بھی صرف لفظ ”مذاق“ کہلے نہ معلوم کس چیز کا مذاق مراد لیا ہے۔ مذاق کے ساتھ
اگر کوئی اور لفظ ترکیب دیکر استعمال کرتے جیسے مذاقِ عشق۔ مذاقِ درد۔ یا مذاقِ ستم تو شعر میں کسی مفہوم کا تعین ہو سکتا
تھا۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود روش کی غزلوں میں طرزِ ادا کی جدت اور ایک شگفتگی پائی جاتی ہے۔ عشق کی عظمت
اور شانِ استغنا کو کس قدر حسن کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

جو راہ اہل خرد کے لئے ہے نامحدود جنونِ عشق میں وہ چند گام ہوتی ہے
ازل سے حسن ہے آمادہ کرم لیکن ہنوز عشق کے لب پر کوئی سوال نہیں
محبت کی لطافتوں کو اشعارِ ذیل میں بہت لطف سے بیان کیا گیا ہے :
خوشی سے بھی بارِ ترجمانی اٹھ نہیں سکتا بہت غمناک رو دادِ محبت ہوتی جاتی ہے

تذکرہ رہتا ہے دل سے سحر و شام اُن کا
ہونے ہی کو ہے اسے دل تکمیل محبت کی
شب بھر نشاط گریہ اُلفت نہ پوچھئے
سکون دل جو جو ملا بھی تو آہ کیا ہوگا
بظاہر تو کوئی وجہ مسرت بھی نہیں ہوتی
سادگی بیان اور طرزِ ادا کی بعض پاکیزہ مثالیں ملاحظہ ہوں :

جس میں ہو یاد بھی تری شامل
کھینچ کر لائے جو ترے در تک
اُن پہ قربان ہستی کو نین
ہائے اُس بخود می کو کیا کہئے
ایسی دیوانگی کو کیا کہئے
اک مری زندگی کو کیا کہئے

جناب روش صدیقی ایک خوشگو شاعر ہیں مگر آپ کی غزلوں میں نچنگی نہیں پائی جاتی۔ نظم آپ کا موضوع شاعری ہے اور آپ نظم ہی زیادہ اچھی کہہ سکتے ہیں۔

۱۸۔ پنڈت امر ناتھ ساحر پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی ایک کہن سال اور کہنہ مشق غزل گو شاعر ہیں۔ آپ کا انتخاب کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا میلان زیادہ تر تصوف کی طرف ہے۔ آپ کے کلام میں بجائے حُسن مجازی کے حُسن حقیقی کی برق پاشیاں نظر آتی ہیں۔ ملاحظہ ہو :-

دیدار شش جہت ہے کوئی دیدہ ورتو ہو
جلوہ کہاں نہیں کوئی اہل نظر تو ہو
جس کی باطن پہ نظر ہے اُسے آتا ہے نظر
قلب کے آئینہ میں حُسن کا تاباں ہونا
آپ عشق مجازی کو عشق حقیقی کا ایک زینہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں :

جلوہ حق نظر آتا ہے صنم میں ساحر
ہے مرے کعبہ کی تعمیر صنم خانوں سے

آپ کی شاعری میں نہ جوش و ولولہ ہے اور نہ اثر آفرینی۔ بلکہ اشعار کی بنیاد تخیلات پر رکھی گئی ہے۔ رنگِ تغزل آپ کے یہاں بہت ہلکا ہے، مگر کہیں کہیں بلند خیالی کی اچھی مثالیں آپ کے کلام میں نظر آ جاتی ہیں مثلاً :-

گویا زبانِ حال تھی۔ ساحر خموش تھا
یہ سچی ضبط تھا۔ وہ تقاضائے ہوش تھا
ہے مقتضائے حُسن کہ دیکھے نہ دیکھ کر
بے تمنائی نے برہم رنگِ محفل کر دیا
کیفِ مستانِ ازل کفر سے آزاد نہیں
دل کی بزمِ آرائیاں تھیں آرزو کے ساتھ
بخود می کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

آپ نے کہیں کہیں کیفیات کی بہت عمدہ مصوری کی ہے۔ مثلاً

ہم ہیں اور بخود می و بنجری
اب نہ رندی نہ پارسائی ہے

۱۹۔ سیماب اکبر آبادی جناب سیماب اکبر آبادی نہایت پُرگو اور مشاق شاعر ہیں۔ آپ نے خُصرت داغ دہلوی سے مشورہ سخن کیا ہے۔ اور اسی لئے آپ کے کلام میں ایسے نمونے

ماتے ہیں جو دورِ قدیم کی شاعری کی یادگار ہیں۔ جیسے:

قاتل کا نام لکھ دیا کیوں میری قبر پر

مٹا دو۔ خاک کر دو۔ پھونک دو۔ کر دو فنا لیکن

وہ اُنکا جاننا دامن جھٹک کر۔ وہ بیٹھ جانادل کا دھڑک کر

کہیں کہیں اشعار میں لکھنوی اسکول کی مخصوص یا سبقت

ہم اپنی موت پر دیکھیں کسی کا اسکا تر کرنا

کسی مردِ وفا کا کوچ ہے پھر اپنے مسکن سے

ہم کو تو جاگنا ہے ترے انتظار میں

کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے

دیتا مجھے فریبِ نویدِ حیات تم

آ۔ اور آخری نگہ یاس دیکھ جا

لیتے ہیں راہگیر بھی بو سے مزار کے

ہمارا جذبہ فطری کہیں برباد ہوتا ہے

وہ اُن کا آنا وہ شادمانی۔ ہائے محبت ہائے جوانی

مرثیت کے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

ہمیں بھی انعقادِ ہزم مآتم کی خبر کرنا

اُداسی مانگنے آئی ہے دُنیا میرے مدفن سے

آئی ہو جس کو میند وہ سوئے مزار میں

جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے

جب لوگ جا رہے ہوں جنازائے ہوئے

شاید پھر اس کے بعد عیادت روا نہ ہو

جناب سیما بکبر آبادی نے ہر چند کہ جدت بیان اور طرزِ ادا سے اپنی شاعری کو ایک نیا آب و رنگ دیکر پیش

کیا ہے مگر اُن کے یہاں فرسودہ مضامین اور سنی سنائی باتیں بھی نظر آ جاتی ہیں اور اُن کا دامن شاعری بھی تقیید

کے شغف سے داغدار ہے۔ ملاحظہ ہو:

صحیح گلشن میں بنے پھرتے ہیں دامان بہار

نظر آتا نہیں وحشت میں کہیں دستِ جنوں

لگی دل کی بھڑک اٹھی ہے داغ کہنہٴ دل سے

طو راے خاکستر سوزِ دلِ موسے بتا

شامِ فرقتِ انتہائے گردشِ ایام ہے

یوسف کی طرح عشق میں خود داریاں کہاں

جنوں کی نذر سالانہ کا سماں دیکھ لیتا ہوں

چند ٹکڑے جو مرے چاک گریاں میں نہیں

اور کھینچے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

کوئی پروانوں کو آواز دے لے اُن کی محفل سے

جو دئے تھے برق ایمن نے وہ جلوے کیا کئے

جب تک صبحی میں ہو چکی ہیں۔ آج سب کی شام ہے

ورنہ مذاقِ حسنِ زلیخا سے کم نہیں

بہار آتے ہی پہلے میں گریباں دیکھ لیتا ہوں

مگر ان تمام باتوں کے باوجود جناب سیما بکبر آبادی کی شاعری اپنے اندر ایک اثر رکھتی ہے۔ آپ کے اشعار کا

طرز بیان - زبان میں نئی تراش خراش - اور تراکیب میں جدت - یہ سب آپ کے کلام میں زور و اثر پیدا کر دیتے ہیں

بعض بعض معمولی باتوں کو اپنے طرز ادا اور اسلوب بیان سے اس قدر پُر لطف بنا دیتے ہیں کہ شعر کو بار بار پڑھنے کو

جی جانتا ہے۔ ایک عام روایت ہے کہ برقی امین نے طور کو خاکستر کر دیا اور جنابِ موسیٰ پر آنی نہ آئی اور صرف

یہ ہوش ہو کر رہ گئے، اس کو جناب سیما ب نے کس قدر نئے انداز سے بیان کیا ہے :

شاید منہی بھی آگئی اُن کو جلال میں

بجلی گری اور آئخ نہ آئی کلیم یر

ایک شعر اور ملاحظہ ہو:-

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں
سادگی و طرزِ ادا کے علاوہ ہر لفظ کانٹے کی نیلی چیز معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کو کہ ایک انسان اگر غمزدہ ہو تو اسکو
ہر چیز بُری معلوم ہوتی ہے اور اگر وہ خوش ہو تو اُسے ہر شے اچھی۔ کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے :-
نہ کلی ہے وجہ نظر کشی - نہ کنول کے پھول سے تازگی فقط ایک دل کی شکفتگی سبب نشاطِ بہار ہے
انسانیت کے متعلق جناب سیماب اکبر آبادی کا تخیل بہت بلند ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:
ہے کوئی اور شے انسانیت میرے تخیل میں خیالوں میں کبھی تصویرِ انساں دیکھ لیتا ہوں
ابھی تک محشرِ انسانیت میں تلاشِ آدمیت ہو رہی ہے
حسب ذیل اشعار میں سادگی بیان - غلوئے تخیل اور اسلوبِ بیان قابلِ ملاحظہ ہیں :-
میں جیا بھی دُنیا میں اور جان بھی دیدی یہ کھل سکا لیکن آپ کی خوشی کیا تھی
کہانی میری رو دِ اوجہاں معلوم ہوتی ہو جو سنتا ہے اُسی کی داستان معلوم ہوتی ہو
اس طرح مجھے ستارے ہو جیسے میرا خدا نہیں ہے
دُنیا سے اک افسانہ کہنے کو تھے پھر سوچا دُنیا ہے خود افسانہ - افسانے سے کیا کہئے
کیا آگئی منہ اہلِ محفل ؟ کہنی تھی ہمیں بھی اک کہا فی
بھاری قدم - نظرِ متحیر - نفسِ دراز کیا ہم حدودِ کوچہ جاناں میں آگئے
مری حیرت پہ وہ تنقید کی تکلیف کرتے ہیں جنہیں یہ بھی نہیں معلوم نظریں ہیں کہاں میری
مگر جناب سیماب کی شاعری میں سوز و گداز کم ہے اور غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ نے تخیل سے زیادہ کام لیا ہے
مثلاً آپ کا ایک شعر ہے:

طور، اے خاکستر سوزِ دلِ موسے بتا جو دئے تھے برقِ امین نے وہ جلوے کیا کئے
اس شعر میں نہ کوئی جذبہ ہے نہ معنی آفرینی۔ چند الفاظ کے اُلٹ پھیر سے شعر بالکل ایک چیتان بن کر رہ گیا ہے۔
کہیں کہیں آپ کے کلام میں خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ آپ کا ایک شعر ہے :-

شورِ ہستی ابھی ذرا ٹھیرے سُن رہا ہوں صمیر کی آواز
”شورِ ہستی“ بالکل ایک مہل سی بات ہے اور اس ٹکڑے سے ہم کسی مفہوم کا تعین نہیں کر سکتے۔ ہستی کے شور سے
جناب سیماب صاحب کی کیا مراد ہے۔ یہ شعر سے بھی واضح نہیں ہوتا۔

دل جلا - پھر خود جلے - پھر ساری دُنیا جل اٹھی سوز لائے تھے بمقدارِ پر پر و ا نہ ہم
”سوزِ پر و ا نہ“ تو سنا تھا مگر ”سوزِ پر پر و ا نہ“ بہت عجیب بات ہے۔
یہ فضا - یہ ابر - یہ ٹھنڈی ہوا - یہ سبزہ زار آج تو جنگل کا جنگل متا بلِ تصویر ہے
”جنگل قابلِ تصویر ہے“ غلط ہے اور محاذِ رے کے فلاح -
شوقِ دیدار کا کیوں اُن سے اعادہ نہ کریں لاؤ وہ کام کریں ہم جسے موسے نے نہ کریں

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں ”جسے موت نے نہ کیا“ کے بجائے ”جسے موت نے نہ کریں“ نظم کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔
۲۰۔ فانی بدایونی حضرت فانی بدایونی ہندوستان کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں اور اپنے کلام کے سوز و گداز کی وجہ سے مشہور ہیں۔ فانی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُن کے یہاں تیر کا سا سوز اور غالب کا سا تصوف و فلسفہ حیات ہے۔ لیکن تیر اور فانی کے سوز و گداز میں بین فرق ہے۔ تیر کی طرح فانی کی زندگی بھی سوگوارانہ بسر ہوئی ہے مگر اُن کے یہاں شکوہ غم کے بجائے ضبطِ غم نظر آتا ہے۔ اُن کی آواز میں درد ضرور ہے مگر وہ یاسیت نہیں جو لکھنوی اسکول کے لئے مخصوص تھی۔ اُن کی شاعری میں سوز و گداز ضرور ہے مگر قنوطیت نہیں۔ ہمیں اُن کے اشعار سے اُن کی زندگی کا ایک دھندلا سا خاکہ نظر آتا ہے اور اُن کا کلام ایک حد تک اُن کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی زندگی کا صحیح نقشہ اپنے ان اشعار کے ذریعہ سے کھینچتے ہیں۔
 ملاحظہ ہو :-

یہ زندگی کی ہے رودادِ مختصر فانی وجودِ دردِ مسلم - علاجِ نامعلوم
 مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات وہ رہ گزر ہوں جسے کوئی نقشِ پانہ ملا
 انہوں نے حیات انسانی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اُن کے تاثرات غم نے اُن کے تجرباتِ زندگی اور مشاہدہٴ عالم کو وسیع سے وسیع تر بنا دیا ہے۔ ہجومِ آلام و مصائب نے اُن کی زندگی کو ایک معمہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-
 اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کا ہے کوہِ خواب ہے دیوانے کا
 آپ غالب کی طرح قیدِ حیات و بندِ غم کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں :-
 زندگی یادِ دوست ہے - یعنی زندگی ہے - تو غم میں گزرے گی
 طولِ رودادِ غمِ معاذ اللہ عمرِ گزری ہے مختصر کرتے
 فانی کے احساسِ غم میں تیر کی سی محرومی، سپردگی و فتادگی نہیں پائی جاتی، وہ احساسِ غم ہی کو مایہٴ حیات سمجھتے ہیں۔ وہ غم کو بہ خندہ پیشانی برداشت کرتے ہیں اور اسی ضبط و تحمل کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ وہ غم کی لطافتوں سے اس قدر بنخود و مسرور ہیں کہ دوسروں کو بھی بارِ غم اٹھانے کی تلقین کرتے ہیں۔ جیسے :-
 غیرت ہو تو غم کی جستجو کر ہمت ہو تو بے قرار ہو جا
 اُن کے لئے جفا کے دوست بھی وفائے دوست ہے اور اُن کا یہ مذاق تلخ پسندی اُن کے لئے باعثِ سکون ہے طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے جفا کم کر۔ جفا اب روح پرور ہوتی جاتی ہے وہ اس قدر مانوس غم ہو چکے ہیں کہ وہ اپنے دردِ دل کا علاج بھی اسی غم کو تصور کرتے ہیں۔ وہ اپنے دردِ غم میں ایک کیفیتِ پنہاں پاتے ہیں، جس میں وہ اپنی ہستی کو گم کر دینا چاہتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ :-
 ہاں ! ناخنِ غم کمی نہ کرنا ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے
 وہ دردِ غم ہی کو سرمایہٴ زلیلت سمجھتے ہیں اور اپنے دردِ دل کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ۔ وہ انسان کی اس فطرت سے بھی واقف ہیں کہ ہر شخص مسرور ہونا چاہتا ہے اور عیش و عشرت کا خواہشمند ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ

اپنے تجربہ حیات اور مشاہدہ عالم کی بناء پر دل غزدہ کو ان سامانِ راحت پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں
میری ہوس کو عیش و دو عالم بھی ہے قبول تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا
اور اس کیفیتِ غم کی برتری کو کس حُسن و خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

غم بھی گزشتنی ہے۔ خوشی بھی گزشتنی
کرم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو
وہ انھیں احساساتِ غم کی لطافتوں میں گم ہو کر اور اپنے دردِ دل کی کیفیات میں بیخود ہو کر درد و غم کی شدت کو کم کرتے
ہیں اور یہی بیخودی و سرشاریِ غم ہے جو انھیں سب سے بے نیاز ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔ وہ اپنے احساسِ غم کے
آگے سب کچھ بھٹلا دینا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ اُن کی ہستی کی اہمیت میں کوئی فرق نہ آئے۔ اسی کو حسب ذیل شعر
میں بیان کرتے ہیں:

یوں سب کو بھٹلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے
دنیا ہی میں رہنا ہے تو دنیا سے گزر رہا
ہمیں جنابِ فانی کے کلام میں حیات و کائنات کے مطالعہ کے علاوہ تغزل کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں جو اُن کے
شدید احساسات اور نازک جذبات کا پتہ دیتی ہیں اور پھر یہی لطافتِ غم اُن کے اشعار میں سوز و اثر پیدا کر دیتی ہے۔
چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

رفتہ نظر ہو جا۔ سب سے بے خبر ہو جا
کھل گیا ہے راز اپنا کھل نہ جائے راز اُنکا
سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لیکر کوئی غافل ہو گیا
آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا
میں بہ عنوانِ دگر یاد آیا
بہلا نہ دل نہ تیرگیِ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں
تسکین عجیب چاہتا ہوں،
دشمن کا نصیب چاہتا ہوں
درپیش ہے پھر مسئلہ طاقِ دیدار
پھر کچھ نگہِ شوق ہے گہرائی ہوئی سی
کچھ نظر کہ گئی زباں نہ کھلی،
بات اُن سے ہوئی مگر نہ ہوئی
یوں ہی ہر نگاہ سے وہ نگاہ
آج تسکین دردِ دل مانی
ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی
وہ بھی چاہا کئے مگر نہ ہوئی
ان اشعار میں لطافتِ غم اور کیفیاتِ بیخودی و سرشاری کی حدیں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے اشعار
میں کہیں کہیں تعبیرِ شاعرانہ کی عمدہ مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے:

اک برقِ سرطور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہنہی آئی ہوئی سی
کس قدر لطیف اور نازک سیرائے بیان ہے کہ طبیعت و جد کرنے لگتی ہے۔ ایک اور استعارہٴ بعید اور شاعرانہ
نازک خیالی کی اعلیٰ مثال جو حضرتِ فانی کے احساساتِ لطیف کا پتہ دیتی ہے ملاحظہ ہو:-

کرم کیا تو باندازہٴ تبسمِ برق
وہ کچھ خیال میں آئے ہی تھے کہ آگے چلے
آپ نے اپنے مشاہدہٴ کائنات کو بعض بعض جگہ نہایت پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ

انفکات سب شعر میں جان ڈال دیتا ہے۔ جیسے:

تنگوں سے کھیلے ہی رہے آشیاں میں ہم
بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا
سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرائے کو
منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

جناب فانی کہیں کہیں اضداد کو نہایت پر اثر طریقے سے یکجا کرتے ہیں اور بعض مرتبہ چھوٹے چھوٹے جملوں کی تکرار نہایت لطف پیدا کر دیتی ہے۔ مگر اس طرح کہ کوئی بناوٹ اور تصنع شامل نہیں ہوتا اور کلام آواز کے عیب سے پاک ہوتا ہے۔ بلکہ ہر شعر ایک غیر ارادی جذبہ کی اعلیٰ مثال اور معنویت کا دفتر معلوم ہوتا ہے گویا کہ دریائے تاثیر و لطافت موجیں لے رہا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

اُس کو بھولے تو ہوئے ہو منائی
معا ہے کہ مدعا نہ کہوں
کیا کرو گے جو اگر یاد آیا ، ،
پوچھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے
دشمن جاں تھے تو جان مدعا کیوں ہو گئے
بھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
کل تک جو تم سے کہ نہ سکا حال اضطراب
ملتی ہے آج اس کی خبر اضطراب سے

ان تمام اشعار کی لطافت و معنویت اہل ذوق حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے جناب فانی کے یہاں اس قسم کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ آپ کے اشعار خواہ وہ دلی جذبات و احساسات کا پر تو ہوں خواہ مشاہدہ کائنات کا نتیجہ، سوز و اثر سے خالی نہیں۔ آپ کی آواز دل سے نکلتی ہے اور دل میں اثر کر جاتی ہے اور یہی اثر آفرینی و سوز و گداز آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں

سید علی سجاد قہر اکبر آبادی۔ بی۔ اے

(باقی)

گلشن صحافت میں ایک غنچہ نو کا اضافہ

”شباب“

ادب اُردو کا ایک ترقی پسند ماہنامہ

ملک کے مشاہیر اہل قلم حضرات کے بلند پایہ مقالے۔ ترقی یافتہ ادب کے اعلیٰ مضامین۔ دلچسپ معیاری افسانے۔ اعلیٰ نفسیاتی ڈرامے۔ تاریخی شہ پارے۔ روح نواز پرکیت غزلیں۔ وجد آور سرمدی نظمیں۔ دلاوینہ پیارے پیارے گیت۔ ادب ماہ اپنی تمام رعنائیوں، دلفریبیوں اور معنوی خوبیوں کے مطلع صحافت پر عنقریب جلوہ گر ہوگا۔ نمونہ کا پرچہ بالکل مفت روانہ ہوگا۔ فوراً اپنے اسم گرامی اور مکمل پتہ سے مطلع کریں۔

مینجر ”شباب“ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶-۳۱۔ ممبئی ۳

پردہ

میں خیال کر رہا تھا کہ ”میں نے رات کو پہلے کبھی دیکھا تو ہے نہیں پھر ایسا کیوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں بہت پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں ایک اجنبی ہوں لیکن ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے وہ برسوں سے میرے ساتھ رہتی ہے!“

ایک دن بنگلے کے باہر میں انتظار کرتے کرتے تھک چلا تھا، ایک شخص دو چار منزل طے کرنے کے بعد بھی مکن ہو کہ اُس کو تکان نہ ہو، لیکن بنگلے کے باہر انتظار کرنا ایک آدمی کو تھکا ہی دیتا ہے، اسکی طبیعت اُگتا جاتی ہے۔ وہ چاروں طرف دیکھتا ہے کہ اس کو ایسی چیزیں دکھائی دیں جن سے اس کا دل پہلے لیکن جب کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی تو وہ آخر تھک جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت میری تھی جب میں پہلی بار اس بنگلے پر آیا۔ گھنٹی بجادی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد چیرا سی آیا اور ”ابھی بیٹھے“ کہہ کر چلا گیا۔ پھر دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ بنگلے کے باہر کوئی نہیں آیا۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کہ میں یہاں گھنٹوں سے انتظار کر رہا ہوں۔ سڑک پر موٹر گزرنے۔ دو چار آدمیوں کے گزرتے گزرتے بات کرنے اور پرندوں کی آواز کے سوا کسی قسم کی آواز کان میں نہیں آرہی تھی۔ میں بنگلے کے شیشوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شیشے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے نظر کے سامنے پتھر رکھ دئے ہوں کیونکہ ان کے پیچھے کوئی نظر نہ آ رہا تھا پھر بھی ٹکے ہوئے تھے مگر وہ ہل نہ رہے تھے ایسی خموشی میں آدمی کا خیال نہ معلوم کہاں کہاں جاتا ہے اور میں نہ معلوم کیا کیا سوچ رہا تھا جو اس وقت مجھے بالکل یاد نہیں۔ میں یہ ضرور خیال کر رہا تھا کہ جب یکایک میرے سامنے وہ آدمی آئے گی تو میں اسکے ساتھ کس طرح سے پیش آؤں گا۔ میں اجنبی ہوں وہ مجھے جانتی نہیں..... اور اس کے بعد میرا خیال منتشر ہو گیا۔ پردہ کے پیچھے دو پاؤں دکھائی دئے جو فوراً ہی غائب بھی ہو گئے! پھر چپ اُٹھی اور چیرا سی نے کہا۔ ”آئیے“ میں بنگلے میں داخل ہوا تھا، خود کو غیر سمجھ کر، مگر پھر غیرت کا سوال دور ہو گیا۔ پہلے ہی دن اُس کا مسکراتا، ایسا معلوم ہوا جیسے اسے کسی جانے پہچانے آدمی کو دیکھا ہو! کتابوں میں سے کچھ باتیں اس نے پوچھیں اور اس طرح جیسے وہ مجھ سے برسوں سے پڑھ رہی ہو اور میں نے اس کو جواب دیا، اور اس طرح گویا میں عرصہ سے اسے پڑھ رہا ہوں۔

”ہم اپنی طاقتیں کمانے اور خرچ کرنے میں کھودیتے ہیں۔“ میں درڈسور تھ کی نظم کا مطلب سمجھا رہا تھا کہ سچ ہی میں اس نے اعتراض کیا ”سب تھوڑے ہی ایسے ہوتے ہیں“ میں نے کہا ”ہاں سب ایسے نہیں ہوتے“ اور مجھے ہنسی آگئی خیال کیا کہ کہہ دوں کہ آپ کے لئے ہی تھوڑے کہا گیا ہے!“ انگلینڈ ہی میں ایسے لوگ ہوتے ہوں گے!“ اس نے طنز سے سے کہا اور میں نے بھی کہہ دیا ”ہاں ہندوستانی ایسے نہیں ہوتے۔ بہت اونچے لوگ ہیں!“

دو چار روز بھی نہیں گزرے تھے کہ باتوں باتوں میں وہ میرے اوپر بھی طنز کرنے لگی۔ ایک اجنبی کے ساتھ ایسی

بغیر پڑھے ہی اُٹے جا رہی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ سطروں کے بیچ میں اپنی نگاہ جمائے ہے اور اس کا دل کہیں اور ہے۔ کمرہ کی خاموشی اس وقت مجھے کتنی خوفناک معلوم ہو رہی تھی! میں بھی دوسری کتاب کے ورق اُٹھنے لگا۔ کسی نہ کسی طرح سے خاموشی کو توڑنے کے لئے میں نے کہا: ”آپ کتاب پڑھ لیا کریں ورنہ اس سے کیا فائدہ کہ ہم آپ دونوں ورق اُٹھتے رہیں!“ وہ اس بات پر ہنس ہی دی۔ اس نے ورق اُٹھنے بند کر دئے اور یہ کہتے ہوئے کہ ”آج کچھ نہیں پڑھنا ہے!“ اس نے کتاب بھی بند کر دی۔

اب اس کے ماتھے پر کبھی بندھی لگی ہوتی کبھی مٹی ہوتی۔ کبھی اس کا پہرہ چمکتا ہوتا کبھی پھیلا۔ کبھی وہ مسکراتی رہتی کبھی چپ ہو کر بیٹھ جاتی!! اب وہ ایک طرح کی پہیلی بنتی جا رہی تھی۔ کبھی میں اپنے آپ کو اس کے قریب اتنا ہی پاتا جتنا پہلے او کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ میں دور ہوتا جا رہا ہوں۔ کبھی وہ مجھ سے بہت دور مٹی نظر آتی اور کبھی وہ ایسی باتیں کرتی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ میرے دل چھونے کی کوشش کر رہی ہے! چنانچہ ایک دن رات نے مجھ سے پوچھا ”آپ کو کونسی کہانی پسند آتی ہے!!“ اس سوال کا جواب دیتے وقت میں عجیب کشمکش میں پھنس گیا۔ کیا اس نے یہ سوال میرے دل کے جذبات جاننے کے لئے پوچھا تھا۔ اور جب میں نے اس کو نہتے ہوئے پایا تو میں بالکل کھو گیا، اور بالکل نہ سمجھ سکا کہ کیا جواب دوں؟

رات کی شادی کو آٹھ روزہ گئے تھے اور اُس کے رشتہ دار اس کو لیکر اپنے شہر جا رہے تھے۔ آج آخری مرتبہ پڑھانا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ رات بالکل بات نہ کرے گی اور اس کا چہرہ اُداس ہوگا، لیکن میں نے کوئی خاص تبدیلی اس میں نہیں پائی، وہ باتیں بھی ویسی ہی کر رہی تھی۔ شیکسپیر کی ایک نظم کے متعلق وہ سوال کرنے لگی کہ ”شیکسپیر یاد ہی کیوں کرتا تھا جب اس کو تکلیف ہوتی تھی!“ میں اس کا کیا جواب دیتا کہ یاد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں۔ وہ بولی ”کیا فائدہ“ میں نے کہا ”کچھ نہیں“۔ شاید آپ کسی کو یاد نہیں کرتیں!“ وہ بولی ”نہیں“ وقت ختم ہو گیا تھا مگر میں نے کہا: ”اب تو آپ بہت دنوں کے بعد پڑھیں گی جو کچھ پوچھنا ہو پوچھ لیجئے۔ اس نے کہا ”جب ہی پوچھوں گی“۔ میں نے کہا: ”جب تک آپ سب بھول جاویں گی“ مگر اس نے کہا: ”پھر یاد کر لیں گے“ رات کی اندھیری مجھے سڑک پر چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھی، آسمان پر بادلوں تھے، چاند تارے سب بادلوں میں چھپ گئے تھے۔ آج زیادہ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور میں کوٹ میں سکڑتا ہوا کالی کالی سڑکوں پر سے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ روزانہ وہ راستہ خیالوں میں کٹ جاتا تھا اور یہ بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ ایسا لمبا راستہ کیسے کٹ گیا مگر آج راستہ کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔ قدم بھاری پڑنے لگے تھے۔ اندھیری بوجھل معلوم ہو رہی تھی راستہ میں نہ جانے کیوں مجھے پچھلی باتوں کا خیال آ رہا تھا۔ اپنی زندگی کے ورق کیوں اُلٹ رہا تھا اور ان ورقوں کو دیکھ کر کیوں دل پر بھاری ہوا چھا یا جا رہا تھا۔

میں یہ خیالات لیکر بستر پر لیٹ گیا۔ سونے کے لئے آنکھ بند کیں مگر خیالات دماغ میں چکر لگانے لگے۔ سوچ رہا تھا کہ میری زندگی بھی عجیب ہے! جس چیز کو پانے کی کوشش کرتا ہوں وہ ہاتھ سے پھسل جاتی ہے۔ انسان کی زندگی ہزاروں خواہشوں سے بھری ہے اور جن کی وہ خواہش کرتا ہے وہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں!!۔ ارمانوں کا

تیجی ہی ہوتا ہے!! میں بھی انسان ہوں۔ میرے دل میں بھی ارمان ہیں اور میرے ارمانوں کا بھی یہی نتیجہ ہوا۔
 راتے آج اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ میں خود کو اجنبی خیال کر رہا تھا۔ میں اپنے دل میں یہ خیال کر کے بچپتا رہا تھا کہ
 میں نے خود کو اتنا قریب کیوں خیال کیا۔ اپنے آپ کو دھوکا کیوں دیا۔ جس روز راتے کی شادی کی خبر سنی تھی اسی روز
 سے میں اجنبی سا ہو گیا تھا۔ لیکن اگر وہ مجھے اجنبی خیال کرتی تھی تو وہ میرے جذبات جاننے کی کیوں کوشش کرنے
 لگی تھی۔ میں اس وقت عجیب شش و پنج میں پھنسا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید شادی ہمارے دونوں کے بیچ میں
 کوئی پردہ نہ ڈالے گی۔ یاد مٹانی نہیں جاتی چاہے راتے کتنی ہی بار کہہ دے کہ وہ کسی کو یاد نہیں کرتی!! انھیں خیالوں
 میں اُلجھا ہوا سو گیا۔

میں ایک روز پھر بنگلے پر گیا۔ راتے واپس آگئی تھی۔ آج پھر میں بنگلے کے باہر انتظار کر رہا تھا۔ پھر میں بنگلے کے
 باہر دیر سے بیٹھا ہوا تھا اور میں نے اپنے آپ کو اُس حالت میں پایا جو اول روز پائی جاتی تھی۔ مجھے اندر بلا یا گیا مگر اندر
 جا کر راتے کو نہ دیکھا۔ اس کے باپ نے ضرور بے تکلفانہ بات کی مگر میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہ پردوں
 پر جمی ہیں، تھی اور خیال کر رہا تھا کہ شاید پردہ کے پیچھے سے کوئی آنے والا ہے مگر پردے بے تک نہیں۔ ہاں، پردہ کے
 پیچھے دو پاؤں ضرور دکھائی دے میں نے ان کو پہچان لیا۔ پردہ ہل کر رہ گیا۔ وہ دونوں پاؤں پھر واپس چلے گئے۔
 مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے راتے اور میرے درمیان ایک دیوار چُن دی گئی ہو!

شکر سروپ بھٹناگر (ام-۱)

نگار کے پچھلے پرچے

۲۶ء: جنوری عدہ۔ ۲۷ء: اگست عدہ۔ ۲۸ء: مئی عدہ۔
 ۲۹ء: جولائی، اگست ۸ فی پرچہ، ستمبر عدہ ۸ فی پرچہ۔ اکتوبر ۱۲
 نومبر، دسمبر ۸ فی پرچہ۔ ۳۰ء: جنوری عدہ ۸ فی پرچہ۔ فروری ۱۲
 ۳۱ء: مارچ عدہ ۸ فی پرچہ۔ ۳۲ء: فروری عدہ ۸ فی پرچہ۔
 ۳۳ء: فروری تا دسمبر عدہ ۸ فی پرچہ۔ ۳۴ء: دسمبر عدہ ۸ فی پرچہ۔
 ۳۵ء: فروری عدہ ۸ فی پرچہ، مارچ تا اگست ۱۲ فی پرچہ،
 اکتوبر عدہ ۸ فی پرچہ۔ ۳۶ء: فروری ۶ فی پرچہ، اپریل عدہ ۸ فی پرچہ
 مئی تا دسمبر ۸ فی پرچہ۔ ۳۷ء: فروری تا جولائی ۸ فی پرچہ۔
 اکتوبر، نومبر ۱۲ فی پرچہ، اگست تا دسمبر عدہ ۸ فی پرچہ۔ ۳۸ء: فروری
 تا مئی ۶ فی پرچہ، جون ۱۲ فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۶ فی پرچہ۔

یہ پچھلے نگار لکھنو

مطبوعات طاق بستال

(بہترین انتقادی لٹریچر)

خواب کی دنیا: اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت
 رکھتی ہے۔ اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے
 جس میں مولانا عبدالمالک رومی نے فریوڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید
 حواشی کے ساتھ اردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عدہ
 الہامات شاد: شاد عظیم آبادی کے رتبہ شاعری سے ہر شخص واقف ہو
 لیکن اگر آپ ان کے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی تاریخی مقدمہ کے دیکھنا
 چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ۸
 اقبال کی شاعری: یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے
 اقبال پر اردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے
 اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔
 قیمت ۱۰، علاوہ محصول۔ نگار بک انجینیئر لکھنو

غلط فہمی

غلط فہمی کا نام رکھنے میں غلطی کی رعایت رکھنا سخت ناشکری تھی، کیونکہ غلط فہمی بہت سی مصیبتوں سے نجات کی ایک نہایت جائز صورت ہے اور یقیناً نوع انسان کی اس سے زیادہ توہین اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کی نجات غلطی سے ہو۔ اگر کل سے غلط فہمی کا نظام توڑ دیا جائے تو خدا ہی جانتا ہے برسوں تک کتنے سر ٹوٹنے سے بچ رہیں گے۔

جب کوئی صاحب آپ سے خوب اچھی طرح لڑ لیتے ہیں تو آپ یا وہ کوئی پہلو نکال کر کہتے ہیں ”تو یہ بات تھی۔ مجھے غلط فہمی ہوئی“ اور اس کے بعد وہ آپ کے بچے سے نکل جانے اور آپ ان کے بچے سے نکل آنے پر ہنستے ہیں اور پریشان لباس کو درست کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

لیکن غلط فہمی اس قدر سطحی یا ناقابل اعتناء چیز نہیں ہے اور ہر چند عموماً یہ عذر پیش کرنے والے اتنے معصوم نہیں ہوتے جتنا وہ اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں پھر بھی حیات انسانی کا یہ ایک دردناک واقعہ ہے کہ غیر ارادی غلط فہمیاں اس وقت تک معدوم نہیں کی جاسکتی ہیں۔

میر کو شکایت تھی کہ اسے ”کسو نے یاں کم سمجھا ہے“ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی کو بھی کسی نے سمجھا ہے؟ آپ نے دیکھا ہوگا کہ دو فرقی شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کے مفہوم کے متعلق ہم خیال ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ممالک کی حکومتوں اور باشندوں کے درمیان ایک دائمی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں بلاشبہ ملک کی بہبود کے خواہاں ہوتے ہیں۔ عوام اور ان کے رہنما آپس میں اعتماد، خلوص، کمزور حافظہ، اور فریب کا کھیل کھیلتے رہے ہیں۔ علوم و فنون اور فلسفہ سب کا یہی حال ہے۔ ادیب و شاعر، مصنف و نقاد، استاد و شاگرد کے درمیان ایک کبھی پُر نہ ہونے والا خلا حائل دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک ہی چیز کو مختلف طریقوں پر پیش کرتے، معنی پہناتے اور سمجھتے ہیں۔ اسی کا نام آزادی، ایجاد، تحقیقات اور لیاقت ہے۔ کم و بیش یہی بات ”اسٹوارٹ شیز“ نے لکھی ہے: ”کیا بت جانتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا خود پورے طور پر سمجھتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ کتنی مرتبہ ذہن ملتے ہیں کتنی مرتبہ وہ بالکل جھٹک جاتے ہیں۔ دنیا کی کتنی مصیبتیں اس ٹھیک جانے پر مبنی ہیں۔ ہر مباحثہ اور گفتگو میں یہ ہوتا ہے کہ ہم دوسرے کی بات نہیں سمجھتے۔ ہماری اپنی باتوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاید ہمارے لئے بہتر بھی یہی ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔“

مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ سمجھنے کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ پہلا اور صاف سبب تو یہی ہے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ کہتے نہیں اور دوسرا یہ کہ کہہ نہیں سکتے۔ پہلا سبب پر آگدن اور چار ڈ بہت لطیف روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”کسی حملے کا مطلب وہ ہوتا ہے جو کہنے والا چاہتا ہے کہ سامعین سمجھیں“۔ یہاں مطلب کی تعریف میں اس

امر کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ کبھی کبھی کہنے والا اپنے دلی مفہوم کو قصداً چھپانا چاہتا ہے اور جب تک اس کے الفاظ سے پیدا ہونے والا مطلب اس کے حقیقی مفہوم سے مختلف نہ ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔ تشبیہ و استعارے ہوشیار ہونے والوں کے ہاتھ میں یہی کام دیتے ہیں۔ صنائع و بدائع عموماً اسی لئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ ظرافت کا غیر سنجیدہ پہلو بھی اکثر یہی ہوتا ہے منطق و قانون اسی مقصد سے بازار میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان صورتوں میں حقیقی معنی غیر لفظی ہوتے ہیں اور ایک ہوشیار آدمی ہی انھیں پاسکتا ہے۔ کہ نہ سکنے کی کئی صورتیں ہوتی ہیں مثلاً ایک وہ ہے جو معنی فی بطن الشاعر کہ مرسترد کر دی جاتی ہے۔ لیکن سب سے بڑی چیز جو ہمیں سننے اور سمجھنے سے باز رکھتی ہے زبان ہے۔ اس میں تعجب نہ ہونا چاہئے۔ ہر چیز خود ہی اپنی آسانی اور خود ہی اپنی مشکل ہے۔ اس طرح کی بوا لعجبیوں سے شاید آپ تنگ آچکے ہوں۔ لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ اس ایک جملہ کو اور گوارا کر لیجئے جو ممکن ہے بہت سے ایسے جملوں کا مرثیہ بن سکے۔

ہماری زبان بعض مطالب کو ادا کرنے سے یکسر قاصر ہے اور بعض کو ان کی حقیقت سے قدرے جداگانہ طریقہ پر ادا کرنے کے لئے مجبور۔ اس سے نجات نہیں مل سکتی تا وقتیکہ موجودہ زبانوں کو جنگی بنیاد زیادہ تر عہد وحشت میں اسوقت کی ضروریات کے مطابق پڑی تھی بسوطا اصلاحات کے ذریعہ ریاضی سے زیادہ قریب نہ کر دیا جائے۔ یہ زبانیں عموماً اس قدر مبہم، متلون اور غیر مستقل ہیں کہ ان سے کوئی واضح، مقررہ معنی استنباط کرنا ہر شخص کا کام نہیں رہا ہے۔ ہماری غلطی صرف اتنی ہے کہ ہم نے ہر قسم کے جھگڑے مول لئے لیکن زبان سے کبھی نہ بولے۔ یہ سوال ہی کبھی پیدا نہ ہوا کہ ہمارا ترجمان بھی ہم کو دھوکا دے سکتا ہے ہم مطمئن رہے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے جو سمجھے وہ سمجھے وہ اپنے جہل کے حوالے درانحالیکہ موقع اس قدر حسن ظن سے سے کام لینے کا نہ تھا۔ دو آنکھوں کو ایک ہی ڈھال بجا طور پر بہر و سرخ دکھائی دے سکتی ہے۔ قصور ایک کا نہیں۔ قصور دوسرے کا بھی نہیں۔ قصور اس ڈھال کا ہے جو کسی طرف سبز کسی طرف سرخ رنگ دکھاتی ہے اسکو بھی جانے دیجئے اور دیکھئے ہم کس کس طرح الفاظ پر لڑتے ہیں۔ ایک شخص اٹھتا ہے اور بتاتا ہے کہ وقت پیدائش فلاں لفظ کے معنی یہ تھے اور آج بھی وہی ہونے چاہئیں (خواہ اس کے لئے تمام دنیا کے دوسرے الفاظ و معاملات کے معنی بدل دیئے پڑیں)۔ دوسرا اعلان کرتا ہے کہ اسوقت جو کچھ بھی رہا ہو اب اسوقت ہم جو معنی مراد لیتے ہیں وہی درست ہیں۔ تیسرا حکم لگاتا ہے کہ یہ جھگڑا فضول ہے۔ عقلاً یا وہمکایہ معنی ہونے چاہئیں تب کام چلے گا۔ پھر صحیح کیا ہے؟ — تہذیب مصیبت بالائے مصیبت ہو جاتی ہے جس طرح مہذب کیمیاوی کھانے ہماری صحت کو خراب کر دیتے ہیں اسی طرح تہذیب کے تکلفات ہمیں اور بہت سے دوسرے میدانوں میں زک پہنچاتے ہیں۔ مبالغے اور استعارے دنیا کے آدھے غلط مبحث کے ذمہ دار ہیں۔ یہ چٹخارے کی طرح زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور بجائے اپنا مفہوم ادا کرنے کے لوگ بولنے کے لئے بولنے لگتے ہیں۔ زبان میں بہت سے ڈھلے ڈھلائے مرکبات اور چلتے فقرے ہوتے ہیں جو ہمارے دلی مطلب کو بگاڑتے ہیں لیکن ان سب کو برتنا ہوتا ہے۔ درحقیقت ہمیں بہت کچھ کہنے کی صورت بنانے کے لئے کہنا پڑتا ہے۔ یہ بول زبان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بجائے ہم زبان کی دلچسپیوں کے لئے استعمال ہونے لگتے ہیں۔ اس کی مثال اس دہقانی کی سی ہے جو اپنے جوتوں کو زحمت سے بچانے کے لئے خود پیادہ چلتا ہے۔ بیشک احساس حسن ہر کام میں سلیقہ کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ استعمال حد درجہ بد ذوقی کی دلیل ہے۔ یہ طریقہ شاعری اور ادبی دلچسپیوں کے لئے ہیج موزون ہے لیکن زبان کا تعلق دنیا کے بہت سے کاروبار سے بھی ہے اور وہاں ہمیں ایک صاف، با اصول اور نسبتاً یک معنی زبان کی ضرورت

بڑتی ہے۔ آج کوئی زبان بھی اس معیار پر پوری نہیں اُترتی لیکن ہر زبان کو تھوڑا بہت کھینچ کر اس سطح پر لانا ہوتا ہے۔ اس بات کو اپنے بھی محسوس کیا ہو گا کہ ہماری بہت سی گفتگو کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو اس کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہو۔ بلکہ الفاظ ایک تمثیلی اور باعتبار نیت زیادہ خوبصورت تصور ہوتے ہیں ہمارے مطالب کی۔ یہ بات ٹھیک ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ مشکل بھی ہے کہ ہمارے پاس کوئی مقررہ پیمانہ ایسا نہیں جس کی مدد سے ہم الفاظ کی ظاہری حیثیت سے ان کے حقیقی مفہوم تک پہنچ جائیں یہی بات خوبصورت تمثیلی بیان اور عام استعاروں کے خلاف نہایت مضبوط دلیل بن جاتی ہے۔ میں جب کسی شخص کو بہت سے مجوزہ الفاظ میں سے مناسب ترین لغت انتخاب کرنے میں مشغول دیکھتا ہوں تو مجھے بڑا رشک ہوتا ہے۔ مجھے تو بہت سے اُمور کے اظہار کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں ملتا۔ تمام دوسری باتوں کو چھوڑنے اپنی نفسی کیفیتوں کے بیان کرنے کے واسطے ہی جو ہم سے سب سے زیادہ قریب ہیں ہمارے پاس کتنے الفاظ موجود ہیں۔ قاموس کی ضخامت کا بھرم امتحان کے کمرے میں نہیں اطباء کے مطب اور علماء کی محفل میں کھلتا ہے کئی مرتبہ ہم چیزوں سے بحث کرتے کرتے انکے ناموں سے بحث کرنے لگتے ہیں اور جو باتیں صرف ناموں کے متعلق صحیح ہیں انہیں اشیاء پر منطبق کرنے لگتے ہیں۔ گرامر میں بالخصوص اشیاء اور ان کے مراتب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ مجرد کیفیتوں اور اسما کے جمع کے سلسلہ میں جنس کی اور دوسری بے شمار مشکلیں پیش آتی رہتی ہیں، بہت سے الفاظ کے ساتھ وہی افسانے وابستہ ہو گئے ہیں۔ جن کی بنا پر ان کا استعمال خطرناک بن گیا ہے۔ بالخصوص اس سبب سے کہ ان کے استعمال کے نتائج یکسر غریب لسانی ہوتے ہیں۔ مثلاً ہندو اور مسلمان۔ بعض ایسے الفاظ ذہنی بیماریاں پیدا کرنے کا سبب ہوتے ہیں جیسے مرد اور عورت۔ غرض کہ الفاظ کی قوت اور ان کے مظالم کا ایک طویل سلسلہ ہے جو انسان کے دوسرے گناہوں کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ سمجھنا کوئی میکانیکی فعل نہیں ہے۔ بلکہ ایک معینہ شعوری کیفیت کا نام ہے اور ہر شعوری کیفیت کے بیدار ہونے کے لئے محرک کے موجود ہونے کے علاوہ معمول میں مناسب انفعالی کیفیت کا موجود ہونا بھی لازمی ہے۔ یہ چیز اس قدر ضروری ہے کہ تک خریدنے کے علاوہ ایسے کاموں میں تو خیر عادت کا دخل ہو جاتا ہے اور کوئی کام بغیر ہمت و شوق نہ ہوئے ہوئے نہیں ہو سکتا اور بہت سی باتیں صرف اس لئے ہمیں تکلیف دیا کرتی ہیں کہ ہم انکو محض سن لیتے ہیں اور ادراک و احساس کی وہ مقدار جو انہیں جذب کرنے اور سمجھنے کے لئے ضروری ہے موجود نہیں ہوتی۔ مزید برآں ہم تو ان الفاظ کی طرف سے بھی چوکتے نہیں رہتے جو ہم خود استعمال کرتے ہیں۔ لاگ کے لفظوں میں لوگ بغیر الفاظ کے مقررہ معنوں کی فکر میں پڑے ہوئے انہیں اسی طرح استعمال کرنے لگتے ہیں جس طرح دوسروں کو استعمال کرتے دیکھتے ہیں، اس طرح ان کا جہل چھپا رہتا ہے اور آسانی کے علاوہ یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ چونکہ ایسے موقعوں پر وہ شاذ و نادر حق پر ہوتے ہیں لہذا انہیں یہ یقین دلانا بھی ناممکن ہوتا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں اس لئے کہ ان آدمیوں کو ان کے جہل سے باہر گھسیٹ لانا ایسا ہی ہے جیسے ایک خانہ بدوش کو اس کے گھر سے نکال دینا جس کے کوئی گھر ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ان سطروں میں مسئلہ کے علمی و تحقیقی پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا ہے۔ نہ شاید ایسا کرنا زیادہ صحت یا سہولت کے ساتھ ممکن ہے۔ اس مسئلہ پر زیادہ مشہور لکھنے والوں کی حیثیت بھی زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ اکثر تفصیلات میں ان سے اختلاف رکھنا ممکن ہے۔ لیکن اس اصولی مسئلہ میں اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ہمیں اپنے جذبات و احساسات کو عقل کی روشنی میں اس طرح مرتب کرنا چاہئے جس سے غلط فہمی کا امکان زیادہ سے زیادہ دور ہو سکے۔ زبان بھی ہماری زندگی کا ایک پہلو ہے جسے اس عہد نو میں جب ہر چیز کو یا غسل صحت کر کے باہر نکل رہی ہو یونہی نہ چھوڑ دینا چاہئے۔ زبان کے معاملہ میں بھی تمام دوسرے مسائل کی طرح اصلاح و امتحان کی ضرورت ہے۔ شاید دوسروں سے کچھ زیادہ ہی کیونکہ بہت سے مسائل کا سمجھنا زبان کے پوری طرح سمجھے ہوئے ہونے پر موقوف ہے۔

نظیر حیدر

اکبر الہ آبادی

سترہ سال کا اک نوجوان لڑکا، دُبتلا پتلا، قد ذرا دبتا ہوا، رنگ کچھ کھلتا ہوا، مسیس جھکی ہوئی، پیشانی کی گریں ابھری ہوئی، اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے اور یہ شعر گنگنا تا جا رہا ہے:

چشم عاشق سے گریں نختِ دل بیتاب و اشک
آپ یوں دیکھیں تماشا جاں کر سیما ب و اشک
معلوم نہیں یہ زمین خود اس نے پیدا کی تھی یا شاہ نصیر و ظفر کے کلام کو دیکھ کر اس کے ذہن میں آئی تھی، وہ بہت خوش تھا کہ ایسی مشکل زمین میں اس نے ایک شعر کہا اور نختِ دل کو سیما ب کہہ کر اپنی بے چینی کا اظہار کس خوبی سے کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے میز سے کاغذ اٹھایا اور پینسل سے اس پر دوسرا شعر لکھا:

اپنے دامن پر گرا کر کیوں اسے کرتے خراب
جانتے یکساں اگر ہم گوہر نایاب و اشک
اب اس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی گوہر نایاب اس کے ہاتھ آگیا۔ اس نوجوان کا نام اکبر حسین ہے اور یہ اشعار اس کی فکر کا اولین ثمر ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس نوجوان کا اس وقت شاعری میں کوئی استاد تھا یا نہیں اور یہ اشعار اس کو دکھائے گئے یا نہیں، لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے شاگرد کو جھڑکتا کہ یہ کیا مہمل گوی ہے، تاہم دل ہی دل میں وہ اس امر کا بھی اعتراف کرتا کہ لڑکا ہونا ہمارے ذہین ہے، معنی آفرینی کی خاص اہلیت رکھتا ہے اور اگر اس کی رہنمائی کی گئی تو اچھا شاعر بن جائے گا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں کہ یہ رہنمائی اس نوجوان کو میسر آئی یا نہیں اور فکر سخن جاری رہی یا نہیں لیکن چار سال بعد جبکہ اس کی عمر ۲۱ سال کی ہے، پہلے پہل ایک مشاعرہ میں شریک ہوتا ہے اور ایک طویل غزل خاص والہانہ انداز سے سُنا تا ہے۔ جس کے بعض اشعار یہ ہیں:

دکھلاتے ہیں بُت جلوہ مستانہ کسی کا
یاں کعبہ مقصود ہے بتخانہ کسی کا
نالاں ہے اگر وہ تو یہ ہے چاک گریباں
ہلبُل کی طرح گل بھی ہے دیوانہ کسی کا
تاثر جو کی صحبت عارض نے دم خواب
خجلت وہ آئینہ ہوا شانہ کسی کا
پہونچی جو نگہ عالم مستی میں فلک پر
ہم سمجھے مہ نو کو بھی پیمانہ کسی کا
تاثر محبت سے جو ہو جاتے ہیں بے چین
رو دیتے ہیں اب سُن کے وہ افسانہ کسی کا

ہم جان سے بیزار رہا کرتے ہیں اکبر
جب سے دل بیتاب ہے دیوانہ کسی کا

آپ نے دیکھا کہ اس چار سال کے اندر کتنا فرق ہو گیا۔ ہر چند اُس زمانہ کی غزل گوئی کا پامال انداز اس میں موجود ہے۔

یعنی وہی معمولی تشبیہیں، وہی گل و بلبل اور وہی کعبہ و تہخانہ جو غزل کے عناصر ضروری تھے، یہاں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن "سیماب و اشک" والی بے معنی وقت پسندی کا کہیں پتہ نہیں اور آخری دو شعر تو ان جذبات کا بھی پتہ دیتے ہیں، جنہیں آسانی سے ہم صحیح تغزل میں شامل کر سکتے ہیں۔ زمانہ گزرتا گیا، اکبر شعر کہتے رہے، مشاعروں میں شریک ہوتے رہے، لیکن ماحول کے اثر سے مغلوب و رواج سے متاثر اور زلف و سنبل کے جال میں بدستور گرفتار۔ تاہم وہ فطری صلاحیت جس کو آگے چل کر بالکل دوسری راہ اختیار کرنا تھی، کبھی کبھی منہ سے کچھ اور بھی کہلوا لیتی تھی اور وہ "کچھ اور" اس رنگ کا ہوتا تھا

ابھی سے خون رُللاتی ہے مجھ کو فکرِ مآل، چمن میں بعد ترے اسے بہا رکھا ہوگا

گو بہت کچھ رنج یا رانِ وطن سے تھا، ہمیں آنکھ میں آنسو مگر وقتِ سفر آ ہی گیا

بعد مدت کے نظر آئی جو صورتِ یار کی سو طرح دل کو سنبھالا غش مگر آ ہی گیا

اکبر کے اس ابتدائی دور میں سوائے غزل کے ہمیں اور کچھ نہیں ملتا اور غزل بھی اسی رنگ کی جس میں زیادہ تر قافیہ پیمانی اور رعایتِ لفظی سے کام لیا جاتا ہے۔ اکبر نے اس دورِ شاعری میں اساتذہ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر ایک ایک زمین میں چار چار غزلیں کہیں اور خوب خوب زور آزمائی کی، یہاں تک کہ شاید خود تھکن محسوس کرنے لگے اور جب اس رنگ کو چھوڑا تو ان میں اس قسم کے اشعار کہنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی:

بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

اکبر کا یہ دورِ شاعری دس یا سولہ سال رہا اور جب ان کی عمر ۳۰ سال کی ہوئی تو یہ رنگ بہت کچھ بدلا ہوا تھا۔ اب انکے یہاں زیادہ زور لفظوں پر نہ تھا بلکہ واقعیت پر تھا اور ان کے غزل کا داخلی رنگ بھی بہت کچھ نکھر گیا تھا۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:

کہوں کس سے قصہ درد و غم کوئی ہمنشیں ہو نہ یار ہے جوانیس ہے تری یاد ہے جو شفیق ہے دل زار ہے

یہ نوید اور دل کو جاسنا ہم اسیرِ دام ہیں اے صبا ہمیں کیا چمن ہو جو رنگ پر ہمیں کیا جو فصل بہار ہے

تو ہزار کرتا لگا وٹیں، میں کبھی نہ آتا فریب میں مجھے پہلے اسکی خبر نہ تھی ترا دو ہی دن کا یہ پیار ہے

وہ نظر جو مجھ سے ملا گئے تو یہ اور آفتیں ڈھا گئے کہ جو اس دہوش و خردِ خواب نہ شکستِ صبر قرار ہے

مجھے رحم آتا ہے دیکھ کر ترا حال، اکبر نوم گرجے وہ بھی چاہے خدا کرے کہ تو جس کا عاشق زار ہے

آپ نے دیکھا، اکبر کے دوسرے دور کا غزل گوئی پہلے دور سے کتنی مختلف نظر آتی ہے، پہلے سوز و گداز مفقود تھا اور اب اسکی جانشینی ان کے اکثر اشعار میں بانی جانے لگی، پہلے وہ صرف سطح پر رہ کر بال کی کھال نکالا کرتے تھے اور اب دل کی گہرائیوں تک بھی ان کا ذہن پہنچنے لگا، پہلے ان کے کلام میں تکلف و قصص تھا اور اب اس میں بیباختہ پن ہے پہلے وہ صرف لفظوں سے کھیلا کرتے تھے اور اب وہ معنویت کی طرف مایل ہو چکے ہیں۔ پہلے ان کی غزلوں میں اوچھا پن تھا لیکن اب ان میں وزن پیدا ہو چلا ہے۔

کو نظم کرنے لگے تھے۔ ہر چیز اکبر کے دوسرے دور کی غزل گوئی میں بھی ہمیں اس رنگ کے اشعار کافی نظر آتے ہیں:

اسی کے سایہ میں ہوتی ہے میرے دل کی بسر خدا دراز کرے عمر زلفِ پیماں کی

جماتی ہے لبِ نازک پہ ان کے رنگ اپنا یہ شوخیاں تو ذرا دیکھو سُرخِ پاں کی

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا بد رقعہ وہ ان اشعار سے بھی کر دیتے ہیں:

غم نہیں اس کا جو شہرت ہو گئی ہو گئی اب تو محبت ہو گئی
اب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز مل گئے صاحب سلامت ہو گئی

یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر وکیل ہو کر دنیا کا علمی مطالعہ شروع کر چکے تھے اور دوسری طرف اودھ پنچ کی طنز و نفرت نے ملک میں شوخی و شوخ نگاری کا عام ذوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اکبر جن کی قسمت میں ملک کا بہترین طنز نگار نقاد ہونا مقسوم ہو چکا تھا، اس رنگ سے بہت متاثر ہوئے اور غزل گوئی کے ساتھ ساتھ انھوں نے تنوی، قطعات اور رباعیات لکھنا بھی شروع کر دیں، لیکن ان کا رنگ بالکل علیحدہ تھا اور ایسا ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ اب یہ اودھ پنچ کے مستقل نامہ نگاروں میں شامل ہو گئے تھے اور اس طرح ان کے انتقادی ذوق کو ابھر کا پورا موقعہ مل گیا تھا اس وقت ملک میں انگریزی تعلیم کا چرچا تھا، مغربی تہذیب تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی، عادات و اخلاق میں آزادی پیدا ہو چکی تھی، قدیم معاشرت پر جدید معاشرت چھائی جا رہی تھی، اور سرسید نے کالج قائم کر کے ملک میں دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں ایک وہ جو انگریزی تعلیم اور سرسید کے حامی تھی اور دوسری وہ جو اسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی تھی، اودھ پنچ اس دوسری جماعت کا آرگن تھا، اکبر اسی آرگن کے نامہ نگار تھے اس لئے وہ اسی جماعت کے فرد تھے چنانچہ ۱۸۷۷ء میں انھوں نے جو ایک منظوم خط اودھ پنچ کو لکھا وہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اگر وہ بجائے غزل کے شروع ہی سے تنوی کی طرف توجہ کرتے تو بہت زیادہ کامیاب ہوتے۔ بیانیہ شاعری کا چونکہ میدان وسیع ہوتا ہے اور انتقادی ذوق رکھنے والے شاعروں کو اس میں پھولنے پھلنے کا زیادہ موقعہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے اکبر نے جب کبھی تنوی کے رنگ میں لکھا بہت زیادہ کامیاب ہوئے اور اس سلسلہ میں ان کی وہ نظم جو (سودی) *Sodhi* کی مشہور نظم آبشار لوڈور کے انداز پر لکھی گئی ہے اور جنگ نامہ روم و روس جو غیر مطبوعہ ہے اس بات کا مزید ثبوت ہیں کہ ان میں تنوی نگاری کی بڑی زبردست قوت پائی جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ ان کے کلیات کی ترتیب میں تاریخوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا اس لئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ غزلوں علاوہ قطعات وغیرہ کی صورت میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے کس نظم کو پہلے رکھنا چاہئے اور کسے بعد، لیکن چونکہ وہ ۱۸۸۰ء میں منصف ہو گئے تھے اس لئے ۱۸۷۹ء سے لیکر ۱۸۸۰ء تک کا زمانہ و کالت جہیں اودھ پنچ کے ساتھ نامہ نگارانہ تعلق کے بھی ۲ سال شامل ہیں، ان کی نظم نگاری کا پہلا دور تھا۔

اس زمانہ کی نظموں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ نسبتاً زیادہ طویل ہیں اور ان کو کسی نہ کسی فارسی شعر پر تفسیم کی صورت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ہیں وہ سب انتقادی رنگ کی جن میں مذہب، معاشرت، اخلاق، تعلیم پر وہ وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے، لیکن باوجود اس میلان کے غزل گوئی کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا اور اس میں زیادہ پاکیزگی اور گہرائی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو:

ہم کیوں یہ بتلائے بتیابی نظر ہیں تسکین دل کی یارب وہ صورتیں کدھر ہیں
دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق وہ کیا ہے اک جھلک ہے، ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

پیدا کئے فلک نے تا دیدنی مناظر
غمخانہ جہاں میں وقعت ہی کیا ہماری
اکبر کے شعر سنکر کہتے ہیں اہل باطن،

نیچی ہیں اُن کی نظریں جو صاحب نظر ہیں
اک ناشنیدہ اُن ہیں اک آہ بے اثر ہیں
اب بھی خدا کے بندے کچھ صاحب اثر ہیں

آپ نے دیکھا کہ اس میں اک خاص فلسفیانہ انداز ہے، ایک خاص معلمانہ کیفیت ہے جو مخاطب کو فطرت کے گہرے مطالعہ کی طرف مائل کرتی ہے۔ ان کے تیسرے دور میں ان کی یہ معنی آفرینی برابر بڑھتی ہی رہی اور اُن کی غزل میں ایک خاص وزن پیدا ہو گیا۔ ملاحظہ ہوتین شعر کی ایک غزل :

یہ جتنے ذرے جہاں فانی کے اتنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں
تغیر اتنا کم تعین، تعین ایسا کہ اپنی ہی دُھن
حواس کچھ نیک کام کر لیں کجیچے دامن کو اپنے بھر لیں

خدا کی ہستی کے سبب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بخیر ہیں
کمال ایسا کہ سب ہیں حیرت، جمال ایسا کہ سب نظر ہیں
مرے معافی کی حد نہیں ہے اگرچہ الفاظ منحقر ہیں

ان اشعار کو پڑھئے اور ابتداء کے اُن دو اشعار کو پڑھئے جن میں ”سیما و اشک“ کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر غور کیجئے کہ اکبر کے رنگ تغزل میں آخر آخر کتنا تغیر پیدا ہو گیا تھا۔

اکبر اپنی جس حیثیت سے ملک میں مشہور ہیں، وہ ایک طنز نگار نقاد (*Satiric Critic*) کی حیثیت ہے جس میں اُن کی ظرافت (*Humour*) نے جان ڈال دی ہے۔ اکبر کو ادبی دنیا میں ایک سوشل نقاد کی حیثیت سے جتنی شہرت حاصل ہوئی اس کی مثال مشرق کے لطیفچریں کوئی نہیں ملتی۔ اکبر نے اپنے زمانہ کے ادبی، معاشرتی اور سیاسی رجحانات پر جو تنقید کی ہے وہ بالکل انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا نصب العین مشرق کو مغرب کے تقلیدی اثرات سے بچانا ہے، وہ نئی تہذیب و تعلیم کے مخالف نہیں ہیں، لیکن اس سے مشرق کی اخلاقی روایات کو جو صدمہ پہونچتا ہے اس کی مخالفت ضرور کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ملک کے نوجوان تقلید مغرب میں اپنی قومی خصوصیات اور مذہبی احساسات کو ترک کر دیں اور انھیں خیالات کو انھیں مختلف انداز میں ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ صاف صاف اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :

اک برگ مضحمل نے یہ اسپیح میں کہا

موسم کی کیا خبر نہیں اسے ڈالیو تھیں

اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا

موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں؟

عورتوں کی تعلیم کے متعلق بھی ان کا فلسفہ یہی تھا کہ اگر مغربی تعلیم انھیں مشرق کی گھریلو زندگی سے نا آشنا کر دیتی ہے تو کسی کام کی نہیں اسی لئے وہ پردہ کے بھی حامی تھے اور لڑکیوں کی بجا آزادی کو پسند نہ کرتے تھے، اس موضوع پر انھوں نے بڑی دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ گھر اور شوہر کی طرف سے عورت کی بے اعتنائی انھوں نے ایک شعر میں کس خوبی سے ظاہر کی ہے :

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی

یہ نہ بتلایا کہیں رکھی ہے روٹی رات کی

اسی قسم کا ایک اور طنز ملاحظہ ہو۔ بنارس سے علیگڑھ کالج کے اولڈ بوائز نے ایک رسالہ اولڈ بوائز کے نام سے نکالا تھا

اس پر اکبر فرماتے ہیں :

نکلا بہ آب و تاب بنارس سے اولڈ ہوائے
خواہش ہے اب یہ بعض محبانِ قوم کی
پردہ کی حمایت میں انھیں بہت کچھ لکھا ہے اور بعض جگہ اس سلسلہ میں ان کی طنز نگاری بہت سخت ہو گئی ہے مثلاً:
پردے کی وجہ سے یہ اجازت ہے چار کی
پردہ اٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
عورتوں کی آزادانہ تعلیم اور بے پردگی کا ذمہ دار وہ مرد کو قرار دیتے ہیں اور نہایت لطیف انداز میں اسکا اظہار کرتے ہیں:
خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں تہذب ہیں
حجاب اُس کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا
بے پردگی کا جو نتیجہ ان کی نگاہ میں تھا اسے ایک شعر میں یوں ظاہر کیا ہے:

کیا گزری جو اک پرٹ کے عدد وار ورس کے پولس سے کہتے تھے
اکبر قومی کانفرنس کی ہنگامہ آرائیوں سے بھی زیادہ خوش تھے اور سمجھتے تھے کہ مرض کا حقیقی علاج نہیں ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں
مغرب بھی کئی دولت بھی گئی بنی بنی بھی گئی زیور بھی گیا
مغرب ایسا ملا نسخہ قوم بازی کا
کہ قدر اٹھ گئی دنیا سے عشق بازی کی
قوم کے لیڈروں اور ریفارموں پر بھی انھوں نے خوب خوب طنز کئے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
وہ اصلاح قومی کے باب میں سب سے پہلے اقتصادی اصلاح چاہتے تھے اور مسلمانوں کی ترقی کے باب میں وہ اسی چیز کی کمی پاتے تھے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

انگریز خوش ہے مالک ایر و پلین سب سے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اور خدا کا نام
ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بسکٹ کا صرف چور ہے منڈ کا پھین سہ ہے
تہذیب جدید کی کورانہ تقلید سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہونچا اُس کو اس انداز میں ظاہر کرتے ہیں:

رہ گیا دل ہی میں شوق سایہ الطاف خاص
کھانے کے کمرے سے رخصت کر دیا بعد از ڈنر
مجھ کو آنے کی اجازت دی نہیں بڈروم میں
تھیں فقط پھر پال ہی اور کانٹے مرے مقسوم میں
اکبر بہت مذہبی آدمی تھے اور جدید تعلیم سے جو بیدینی پھیل رہی تھی اس پر بہت دل کڑھایا کرتے تھے بعض اشعار اس خیال کے ملاحظہ ہوں:

ن کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
لا مذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاح قوم
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا
ہرگز گزر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ
مذہب ہے گم ترقی یورپ کے سامنے
معذور فاکسار بھی ہے اور جناب بھی
اکبر کا بڑا کمال بات میں بات پیدا کرنا تھا اور اسی کے لئے ان کا مزاج و طنز زیادہ تر قافیوں کی تلاش پر منحصر ہے۔
ان کے ایک دوست بیماری کے بعد لاہور کسی جلسہ میں شرکت کے لئے جانے لگے انھوں نے کہا کہ ابھی قوت

نہیں ہے آپ کیوں جاتے ہیں، لیکن وہ نہیں مانے۔ اکبر اس خاص واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا قوت

ایک اور شعر نہایت لطیف کنایہ لئے ہوئے ملاحظہ ہو:

سیخ تثلیث کی تردید تو کچھ کرتے نہیں

گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

لفظ تثلیث کے ساتھ ہی، سورہ والتین کی طرف منتقل ہونا اکبر کی شوخ ذہانت کا زبردست ثبوت ہے۔ قافیہ کی تلاش کی چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں:

یا ایہی ٹیشن کے صدقے چا، دوہ اور کھانڈے

یا ایہی ٹیشن کے بدلے تو چلا جا مانڈے

فصل خدا سے عزت پائی، آج ہوئے سی۔ اس۔ آئی

سیخ نہ سمجھے لفظ انگریزی بولے ہوئے ہیں یہ عیسائی

پنجاب کے ایک وکیل الف دین صاحب نے کوئی مذہبی کتاب لکھی تھی اس پر اکبر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

الف دین نے خوب لکھی کتاب

کہ بے دین نے پائی راہ صواب

اُردو میں اکبر ہی پہلا اور شاید آخری شاعر تھا جس نے نظم میں لطیفوں اور چٹکوں کو پیش کیا اور سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس سلسلہ میں وہ اپنے اصل مقصد کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے مغرب کی بیجا تقلید کا اثر دو شعروں میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی

چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر

پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

مغربی وضع کی عام مقبولیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائال

بیج مغرب نے جو بویا وہ اگا اور پھل گیا

بوٹ ڈاسن نے بنایا، میں نے اک مضمون لکھا

ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جو تا پھل گیا

اکبر کا مطالعہ فطرت بھی بڑا زبردست تھا اور اگر وہ خالص منظر یہ شاعری کرتے تو بھی بہت کامیاب ہوتے۔ ایک نظم ملاحظہ ہو جو محاکات و جزئیات نگاری کی بہترین مثال ہے:

دو تیریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں

اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

بھولی، خوش رنگ، چست، نازک، پیاری

پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری

پھرتی ہے کہ برق طبیعت کا ابھار

تیز ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

جو فاصلہ کر لیا ہے باہم متا

وہ بھی ہے بلا زیادت و کم متا

گوتا بے جوش برق پروازی ہیں

دونوں کے خطوط طیر متوازی ہیں

کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے

اللہ، اللہ، کیا ہنر مندی ہے

ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں

فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں

کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں،

پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں

اس نعت اگر خیال انساں بڑھ جائے

دامان نظر پر رنگ عرفاں چڑھ جائے

مکتوبات نیاز

عتاب نامہ کا شکریہ! ————— شکریہ اس لئے کہ ”حسن اتفاق“ سے

جو تیری خوش تھی وہ ہی مرا مدعا ہوا

ورنہ ظاہر ہے کہ گالی سے کون خوش ہو سکتا ہے!

غلطی ہو تو خیر، معذرت میں کوئی حرج نہیں، لیکن دانستہ گناہ کرنا اور پھر عذر کرنا! کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ”وقارِ معصیت“ بھی آخر کوئی چیز ہے یا نہیں؟

بیشک میں نے جواب نہیں دیا، قصداً نہیں دیا اور صرف اس لئے نہیں دیا کہ آپ خفا ہوں اور یہ اب میں اس لئے کہ رہا ہوں کہ آپ کو اور زیادہ غصہ آئے! — فرمائیے، اب آپ کیا کہتے ہیں؟

ہوش میں آئیے۔ دنیا خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور آپ ابھی تک —————

”روئے محمود و خاک پائے ایاز“ ————— والے زمانہ کا خواب دیکھ رہے ہیں!

ایک صدی قبل کی بات ہے کہ دلی کے ایک شاعر نے کہا تھا:

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب!

لیکن یہ بات نشہ کی ترنگ ہو کر رہ گئی — اب اس دورِ اقتصاد میں جبکہ ایک ایک ذرہ کی قیمت متعین ہو چکی ہے، آپ کی ”مہر تابیاں“ کسی کا حق نہیں چھین سکتیں۔ شبنم اور پر تو خور، اب بھی دونوں پائے جاتے ہیں!

لیکن ”فنا کی تعلیم“ کا علمی نام اب ”جذب و انجذاب“ ہے، یعنی دونوں ایک دوسرے کے محتاج!

حضرت اس دورِ اشتراکیت میں نکاح بھی خطرہ میں ہے، ”تعلق خاطر“ کا کیا ذکر؟ — اپنے پر اعتماد نہ ہو تو دوسروں کا آزمانا اب بیکار ہے!

مکرمی - کیا عرض کروں کہ میں نے زندگی کو کیا سمجھا ہے۔ ایک کہتا ہے:

زندگی، زندہ دلی کا ہے نام

دوسرا کہتا ہے:

باز می جویم دل افسردہ را

در انحالیکہ حقیقت کا تعلق شاید ”بہنہ اور روئے“ کے علاوہ کسی اور چیز سے ہے۔ مگر وہ ”اور چیز“ کیا؟

مذہب اس کے جواب میں کہتا ہے: ”العاقبتہ للمتقین“! علم، گلیلو، کولمبس اور اڈیسن کو پیش کرتا ہے۔ یعنی ایک کہتا ہے ”اب سو رہو، اٹھنا تو دیکھنا“ دوسرا کہتا ہے: ”جتنا جاگنا ہو جاگ لو، پھر تو ہمیشہ سونا ہی ہے“۔ بالکل نقد اور ادھار کا فرق ہے۔
میں نے توحضت، یہ داؤں لگایا نہیں۔ آپ کو اگر یہ ”دکھنا“ اچھا معلوم ہوتا ہے تو بسم اللہ!

قبلہ محترم - کس قدر شرمسار ہوں کہ گرامی نامہ کا جواب اتنی تاخیر سے جا رہا ہے، خیال تھا کہ خود حاضر ہو کر عرض کروں گا، لیکن افسوس ہے کہ بعض الجھنوں کی وجہ سے قدمبوس نہ ہو سکا۔
آپ نے جس شک و شبہ کے لہجہ میں مکرم نامہ لکھا ہے، اُس سے مجھے تکلیف ہوئی۔ آپ کو شاید اب تک یقین نہیں کہ آپ کا ہر لفظ میرے لئے ایک فرمان ہے، اور ارشاد گرامی کی تعمیل کرنا میرا ایمان! آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں، ہو چکا اور آج ہی کل میں انہیں اس کی اطلاع بھی براہ راست مل جائے گی۔
یہ بھی کوئی ایسی بات تھی کہ آپ کو اُن سے وعدہ کر لینے میں تامل ہوتا!

حضرت، آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ سے خفا ہوں، اور جب میں خفا ہوتا ہوں تو خطرناک ہو جاتا ہوں۔ پھر کچھ آپ نے سوچا ہے کہ اس خطرہ کا مقابلہ کیونکر کریں گے؟ یہ معاملہ ”آہن بہ آہن“ کا نہیں ہے کہ آپ اپنی برہمی سے اس کا توڑ کر سکیں، بلکہ دق کی اس حرارت کا سا ہے جو آخر میں جان ہی لیکر چھوڑتی ہے۔
اب بھی خیریت ہے۔ کہنا مان جائیے اور اپنا پروگرام ملتوی کر کے، ۲۷ نومبر تک یہاں پہنچ جائیے فرض، اخلاق، مذہب، سیاست۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ اصل چیز میری مرضی ہے اور اسی کی پابندی آپ کو کرنا ہوگی۔ سنا آپ نے؟
اگر آپ کو اس طرح کوئی نقصان بھی پہنچ جائے تو مضائقہ نہیں، ”کشتہ دشمن“ سے ”کشتہ دوست“ ہونا بہر نوع بہتر ہے۔

اگر تم اس باب میں کوئی فتویٰ حاصل کرنا چاہتے ہو، تو مولویوں سے پوچھو، رہی میری ذاتی رائے سو وہ تم کو معلوم ہی ہے۔

میں جانتا ہوں یہ لوگ کیا کہیں گے۔ ایک کی رائے ہوگی کہ تصویر کھینچنا بہر صورت ممنوع ہے (اور یہ رائے اس کی ہوگی جس کی صورت واقعی اس قابل نہیں کہ تصویر لی جائے)، دوسرا کہے گا کہ نیم رُخی (Profile) تصویر میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس طرح نقش میں تجسیم کا رنگ پیدا نہیں ہوتا (لیکن

یہ قول اس کا ہوگا جو اس آرٹ سے بالکل ناواقف ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ”تجسیم“ کی کیفیت نیم نجی تصویر ہی سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے (تیسرا کہے گا کہ نصف دھڑ (Bust) کی تصویر جائز ہے، کیونکہ اس طرح پورا جسم سامنے نہیں آتا) اور یہ رائے اس کی ہوگی جس کے نزدیک خطرہ صرف نیچے کے دھڑ میں ہے اور دل و دماغ بیکار چیزیں ہیں)

الغرض تمام دوسرے مسائل کی طرح اس میں بھی کوئی متفقہ فتویٰ آپ کو نہ مل سکے گا، اس لئے میری رائے میں آپ خود اپنی عقل سے کام لیجئے، ہر حکم کا کوئی نہ کوئی سبب ہوا کرتا ہے۔ اسلام چونکہ بت پرستی کا مخالف ہے، اس لئے اس نے کسی ایسے فعل کی اجازت نہیں دی جس میں ہلکا سا امکان بھی بت پرستی کی طرف مایل ہو جانے کا پایا جائے۔ اور اسی لئے اس نے مجسمہ سازی کی اجازت نہیں دی، تصویر کشی کا رواج اُس وقت عام نہ تھا کہ اس پر غور کیا جاتا۔ بعد کو جب تصویر کا رواج ہوا تو اس پر غور کرنا پڑا اور جواز و عدم جواز کی مختلف صورتیں پیدا کی گئیں۔ حالانکہ دراصل، یہ زمانہ اس قسم کی بحثوں کا ہی نہیں یعنی اب مجسمہ سازی کے لئے بھی علت حرمت باقی نہیں رہی، تصویر کا کیا ذکر ہے۔

جس حد تک اہل علم کا تعلق ہے بت پرستی کا دور بالکل ختم ہو چکا ہے (ہندو مسلمان دونوں کے لئے) رہے جاہل، سوان کے لئے مجسمہ، تصویر، پیل، مزار، سب یکساں ہیں۔ تم کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں ایک جماعت صوفیہ کی ایسی بھی ہے جو اپنے پیر طریقت کی تصویر سامنے رکھ کر اس کے سامنے سجدہ کرتی ہے اور انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ تصویر کیسی ہے۔ پھر ان کے لئے تو تصویر مطلقاً حرام ہونا چاہئے، لیکن صرف اپنے پیر کی!

ان کے برخلاف اہل فن کی جماعت کو لو، جو تصویر کیا اچھے خاصے بت بناتی ہے، لیکن اس کا مقصد صرف فن کی تکمیل ہوتا ہے، تو کیا، ان کے لئے مجسمہ سازی حرام قرار دی جائے گی؟
یہ انتہائی کج فہمی ہے کہ کسی قانون یا شریعت کے کسی حکم کو دائمی چیز سمجھا جائے۔ قانون، وقت، ضرورت اور مصلحت، کو سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک چیز کے بدل جانے پر قانون میں بھی تغیر و تبدل ضروری ہو جاتا ہے۔

جس وقت اسلام نے مجسمہ سازی کی مخالفت کی، یہ وہ زمانہ تھا، جب عرب میں بت پرستی کا رواج، فنی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے، بہ کثرت پایا جاتا تھا اور اس رواج نے اُن کے قواء ذہنیہ کو مضحک کر رکھا تھا، خیال تھا کہ اگر بت سازی سے باز نہ رکھا گیا تو اس مذہب عادت کا استیصال نہ ہو سکے گا لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس وقت بھی کوئی مسلمان ایسا ہے جو محض مجسمہ سازی یا تصویر کشی کی وجہ سے بت پرستی اختیار کر سکتا ہے؟

پھر جب اس کا امکان نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ حکم اس وقت بھی قابل عمل قرار پائے اور اس کو کالعدم نہ سمجھا جائے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خدشہ تمہارے دل میں پیدا ہی کیوں ہوا۔ کوئی اچھی شکل و صورت والا انسان اگر تصویر کھینچوائے تو اسے خیال کرنا چاہئے کہ کہیں لوگ اسے پوجنے نہ لگیں، تمہیں کیا ڈر ہے!

بندہ نواز، خط پہنچا، دلجوئی کا شکریہ، لیکن

تیری وفا سے کیا ہوتا فانی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہر چند ان سب کی شکایت آپ سے تو نہیں ہو سکتی، لیکن ظلم کرنے والوں کی قوم ساری دنیا میں ایک ہی ہے اس لئے آپ سے خطاب کرنا گویا سب سے خطاب کرنا ہے!

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ”عذر گناہ بعد از گناہ“ اور ”کسی زود پشیمان کا پشیمان ہونا“ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا، زمین اس کا نقش لئے ہوئے لاکھوں میل کا چکر لگا چکی، اس کو واپس لینا کسی کے امکان میں نہیں، اب آپ جو کچھ کر رہے ہیں، یہ بھی فضا میں اسی طرح گم ہو جائے گا، پھر یہ فکر کہ گرنے ہو، تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو

بالکل بیکار ہے۔ مجھ پر نہ آپ کی تلخی کا کوئی اثر ہوا، نہ اس ”عذب البیان“ کا۔ ساحل پر کھڑا ہوں اور تھمیرے کھا رہا ہوں۔ موج ہلکی ہو تو کیا، بھاری ہو تو کیا!

خوش رہئے، کہ آپ نے کم از کم یہ تو سمجھنے کا موقعہ دیا کہ:

نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا زداں کیوں ہو

میں اچھا ہوں اور کل شام تک جو کچھ مجھ پر گزری ہے اس سے بالکل خالی الذہن!

اگر آپ نے آئندہ جنوری ۱۳۵۷ء کا نگار حاصل نہ کیا

تو جنوری ۱۳۵۷ء کا نگار بیکار ہے۔ شعراء کے کلام کا انتخاب تو آپ پڑھ چکے،

لیکن اُن پر اہل نقد کی رائے بھی تو معلوم کیجئے۔

مینجر نگار

مراسلات

۸ اکتوبر ۱۳۳۶ء

آگرہ - کوچہ میکھاں

مکرمی - اکتوبر کے نگار میں آپ کی شرح مومن دیکھی۔ دو ایک جگہ مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ جی چاہا کہ آپ سے بھی کہدوں۔ طویل مضمون کی قدر نہیں ہے۔ کارڈ ہی پر لکھے دیتا ہوں۔

شعر نمبر ۱ میں کدورت باطن سے مراد شراب کی تلچھٹ یا اس کا برا نتیجہ لینا، آپ سے تعجب ہے۔ اس کی شرح کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ کچھ مطلب نہیں نکلتا۔ آپ نے غور نہیں کیا۔ کدورت باطن سے کدورت باطن ہی مراد ہے۔ کہتے ہیں کہ میں دل کی کدورت، آلودگی، معصیت کو دھونے کے لئے شراب پینا چاہتا تھا، لیکن وہ جو سامنے آئی تو اس کا رنگ ہی دیکھ کر بخود ہو گیا اور مقصد اصلی یعنی صفات باطن کا ہوش ہی نہ رہا۔ ضمناً بات بھی لکھی کہ سب کے رنگ میں یہ تاثر ہے تو وہ خود کیا کچھ نہ ہوگی۔

شعر نمبر ۲ کے پہلے مصرعہ میں لفظ ہم سے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ نہ اس کے معنی غم کے ہیں۔ یہ بھی آپ کو عجیب سوچھی مومن خاں کے دماغ میں یہ کچی ضرر رہتی کہ ہم (یعنی غم) جیسا نامانوس لفظ ایسے غیر فصیح موقع پر رکھ دیتے، لیکن یہاں نہیں رکھا، خواہ مخواہ ان کی کج دماغی کیوں ثابت کی جائے۔ آپ کو شاید یہ خیال آیا کہ مصرعہ اولیٰ کے دونوں ٹکڑے برابر کے ہیں اس لئے ہم کو غم سمجھا۔ لیکن اس حالت میں مساوات خوبصورت نہ رہتی۔ ایک جگہ مضطر صفت ہے، دوسری جگہ ہم، اہم۔ اس سے تو یوں کہتے: ”شام سے تا صبح غم ہے، صبح سے تا شام ہم“ تو اذن پیدا ہو جاتا۔ دوسرے، آپ نے غالباً دونوں مصرعوں میں ہم کی تکرار کو غلاف فصاحت سمجھا ہوگا، اس لئے پہلے (ہم) کے اور معنی لئے۔ لیکن میرے نزدیک دونوں جگہ (ہم) کا آنا غیر فصیح نہیں ہے۔ نہ کر دیکھئے۔ دونوں مصرعے دوپورے جملے ہیں۔ مومن خاں کا مفہوم یہ ہے کہ ہم شام سے تا صبح اور صبح سے تا شام مضطر رہتے ہیں۔ اے گردش ایام اس کا کیا سبب کہ تیرے اثر سے شام بدل کر صبح ہو جاتی ہے، صبح بدل کر شام ہو جاتی ہے لیکن ہم میں تغیر نہیں ہوتا، ایک ہی عالم میں رہتے ہیں۔

والسلام

احقر حامد حسن قادری

(نگار) میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس طرف توجہ فرمائی۔ لیکن ساتویں شعر کا جو مفہوم آپ نے بیان کیا ہے، اس سے مجھے اختلاف ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مومن دل کی کدورت دھونے کے لئے شراب پینا چاہتا تھا، لیکن وہ شراب کا رنگ ہی دیکھ کر بخود ہو گیا اور مقصد اصلی یعنی صفاتی باطن کا ہوش نہ رہا۔ لیکن آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اس صورت میں اسے یہ کہنا چاہئے تھا:۔۔۔ تو یہ کہاں صفاتی باطن کے ہوش تھے

دوسری بات یہ کہ رنگ سے تاب دیکھ کر غش ہونے کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ اس نے شراب پی ہی نہیں اور وہ صرف رنگ دیکھ کر بے ہوش ہو گیا کیونکہ اس صورت میں نتیجہ یہ نکلا گا کہ مومن کدورت باطن دور کرنے کے لئے شراب پینا چاہتا تھا لیکن نہ پی سکا اور بدستور ”خراب باطن“ بنا رہا۔

غش ہو جانے کے معنی یہاں بے اختیار ہو جانے کے ہیں۔ یعنی وہ شراب کا رنگ دیکھ کر اتنا بے اختیار ہو گیا کہ بلا بس و پیش پی گیا اور یہ خیال نہ رہا کہ یہ ”کدورت باطن“ پیدا کرنے والی چیز ہے۔ افلا تو؟ کا استعمال بھی اسی مفہوم کا موید ہے۔

میسویں شعر کا مفہوم بتاتے ہوئے آپ نے نشر کر کے دیکھنے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نشر نہیں کی۔ ہم کے معنی اگر وہی لئے جائیں جو آپ بتاتے ہیں تو آپ ہم کو کہاں لے جائیں گے اور نشر کرنے میں کتنے محذوفات ماننا پڑیں گے اور کتنی الٹ پلٹ کر نا پڑے گی آپ کے بیان کردہ مفہوم کے مطابق نشر یوں ہوگی: ”ہم شام سے تا صبح (اور) صبح سے تا شام مضطر (رہتے ہیں)“ اور اس صورت میں تعقید ظاہر ہے۔

ہم کو اگر غم کے معنی میں لیا جائے تو سوائے اس عیب کے کہ ایک فقرہ میں مضطر (صفت) ہے اور دوسری جگہ ہم (اسم) نہ نشر کرنے میں محذوفات کے پُر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعقید کا عیب پیدا ہوتا ہے۔

آئندہ جنوری ۱۹۷۲ء میں

حضرات ذیل کے انتقادی مقالے درج ہوں گے

- ۱۔ پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب — پٹنہ یونیورسٹی
- ۲۔ پروفیسر آل احمد سرور — مسلم یونیورسٹی
- ۳۔ ڈاکٹر محمد دین تاشیر — پرنسپل سری نگر کالج
- ۴۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری — سنٹ اینڈروز کالج گورکھپور
- ۵۔ نیاز فتحپوری — ایڈیٹر نگار

مطبوعات موصولہ

قومیت و بین الاقوامیت

مکتبہ جامعہ دہلی نے بعض اہم سیاسی مسائل پر بارہ مقالے لکھوانے کا اعلان کیا تھا اور یہ مقالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کے لکھنے والے محمد قاسم حسن صاحب بی، اے، بی ٹی ہیں، جنہوں نے دس ابواب میں اپنی گفتگو کو ختم کیا ہے، پہلے باب میں قومیت اور دوسری متعلقہ اصطلاحوں کا مفہوم بتایا ہے اور دوسرے میں قومیت کے عناصر سے بحث کی ہے، تیسرا باب جس میں 'قومیت' کے ارتقاء پر تاریخی نظر ڈالی گئی ہے بہت اہم ہے اس کے بعد چوتھے اور پانچویں باب میں مشرق اور مغرب کی قومیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں آفاقیت یعنی عالمگیر قومیت کے نظریہ کو پیش کیا گیا ہے اور پھر ساتویں آٹھویں باب میں بین الاقوامیت اور اس کے ارتقاء کو دکھایا گیا ہے جو بڑی ضروری چیز تھی۔ نویں باب میں اقوام کی انجمنوں سے بحث کی گئی ہے اور آخری باب میں بین الاقوامیت کے مستقبل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

جس حد تک موضوع کا تعلق ہے، مقالہ بہت جامع و مفید ہے اور اس زمانہ میں جبکہ سیاسیات کا مطالعہ ضروری زندگی میں داخل ہو چکا ہو، ایسی کتابوں کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کی ہے اور سیاسی مطبوعات کے سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ اس کے مصنف عشرت حسین صدیقی بی۔ اے ہیں۔

ممالک اسلامیہ کی سیاست

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ شروع سے لیکر اس وقت تک اسلامی ممالک کو دنیا کی سیاست میں کتنی اہمیت حاصل رہی ہے اور اسلامی حکومتوں کے مد و جز کے ساتھ ساتھ اسلامی سیاست پر کتنا اثر پڑا۔ یہ کتاب دراصل ایک تاریخ ہے جس میں مصر، ترکی، عرب، شام، فلسطین، عراق، ایران، افغانستان اور دوسری چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتوں کے جغرافیہ و سیاسی موقف اور اس کے اثرات سے فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔

اخیر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ موجودہ جنگ کا تعلق اسلامی ممالک سے کیا نوعیت رکھتا ہے۔ نقشوں سے کتاب کی افادہ اور زیادہ بڑھ چکی ہے۔ قیمت پچاس روپے ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

مکتبہ جامعہ کے سیاسی مطبوعات کے سلسلہ کی تیسری کتاب ہے اور شاہ حسین رزاقی ام۔ اے (عثمانیہ) اس کے مصنف ہیں۔ "ناتسیت" کا لفظ اس وقت ہر زبان پر ہے، لیکن اس لفظ کا تاریخی پس منظر کیا

ناتسیت

ہے، اسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ "ناتسیت" ہٹلر کی پیدا کی ہوئی چیز ہے، حالانکہ ہٹلر خود ناتسی تحریک کی پیداوار ہے۔

جس کو جناب رزاقی نے کافی شرح و بسط کے ساتھ بتایا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں آمریت کا خیال کیوں پیدا ہوا اور یہ "عمومیت" کے نظریہ کا لازمی نتیجہ کیوں ہے، دوسرے باب میں جرمن مملکت کے ارتقاء سے بحث کر کے ہمارے اور ہٹلر تک تمام سیاسی و انقلابی رجحانات کو پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں بتایا گیا ہے کہ پچھلی جنگ عظیم نے جرمن سیاست پر کتنا گہرا اثر کیا اور چوتھے باب میں جرمنی کے نظریہ اشتراکیت سے بحث کی گئی ہے جس کا دوسرا نام ناسیت ہے۔ پانچویں باب میں معاشی حیثیت سے ناسیت پر گفتگو کر کے کتاب کو ختم کر دیا گیا ہے۔

وہ حضرات جو ناسی تحریک کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انھیں یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہئے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی۔

مکتبہ جامعہ کے سلسلہ مطبوعات سیاسی کی چوتھی کتاب ہے جس میں بحر الکاہل (Pacific Ocean) کی جغرافی، تاریخی و سیاسی اہمیت کو بتایا گیا ہے۔

اس وقت جبکہ جاپان نے ایشیا میں "تنظیم جدید" جاری کرنے کا چیلنج دیا ہے، بحر الکاہل کا مسئلہ نہایت اصولی مسئلہ ہو گیا ہے، کیونکہ اگر جاپان نے اپنے اثرات وسیع کرنے کے لئے واقعی کوئی جنگ ایشیا میں کی، تو بحر الکاہل ہی اس کا مرکز قرار پائے گا۔ اس سمندر کا تعلق ہندوستان، چین، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جزائر فلپائن، وغیرہ سے ہے، اس لئے بحر الکاہل

کی سیاست حقیقتاً ان تمام ممالک کی سیاست سے وابستہ ہے۔ اس کتاب میں نہایت وضاحت کے ساتھ تمام ضروری مسائل متعلقہ سے بحث کر کے بتایا گیا ہے کہ بصورت جنگ یہاں کیا کیا امکانات و مواقع فریقین کے لئے پائے جاتے ہیں۔ متعدد نقلیے بھی شامل ہیں، جن سے تمام ضروری مباحث کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کے مصنف جناب امین خاوری ہیں درحقیقت وہ

خطوط محمد علی | مولانا محمد علی مرحوم کی ذات مختلف حیثیتوں سے عجیب و غریب ذات تھی اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا ان کی ہر ہر حیثیت کا لوگ مطالعہ کریں گے اور داد دیں گے۔ محمد علی، شاعر تھے، سیاست داں

تھے، ادیب تھے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہایت مخلص انسان تھے اور ان کے خطوط کا یہ مجموعہ ان کے اسی خلوص کی داستان ہے۔ انھوں نے دنیا میں خدا جانے کن کن لوگوں کو کیسے کیسے خط لکھے ہوں گے، لیکن اس مجموعہ میں صرف دس حضرات کے نام کے خطوط جمع کئے گئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہر مکتوب اپنی جگہ ایک خاص انتہائی حیثیت رکھتا

ہے۔ ان خطوط کے پڑھنے سے نہ صرف مرحوم کے خانگی مسائل اور خانگی تاثرات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کے سیاسی میلانات اور علمی و ادبی رجحانات کا حال بھی نہایت وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی

ہندوستانی کھیل | جسمانی ورزش کے سلسلہ کی کتاب ہے جسے مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ پہلے بتایا گیا ہے کہ ورزش کس قدر ضروری چیز ہے اور پھر اس کی قسمیں شمار کر کے تمام ورزشی کھیلوں کو تفصیل

کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں گھر کے اندر اور باہر بہت سے کھیل رائج تھے اور ہیں، لیکن کوئی کتاب ایسی نہ تھی جس میں ان سب کھیلوں کا حال درج ہو، کتاب بہت مفید اور دلچسپ ہے۔ قیمت پچھتر

مرقع فطرت

تصنیف ہے ڈاکٹر پریم ناتھ کی جو مشہور آزاد خیال انسان میں اور مذہب و انسانیت کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں اس کتاب میں پہلے بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش تک دنیا نے کتنی تدریجی ترقی کی اور حیات کا ارتقاء رفتہ رفتہ کس طرح انسان کی تشکیل تک پہنچا۔ اس کے بعد فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ دنیا میں مذاہب کی ابتدا کیونکر ہوئی اور مذہب انسانیت کیا ہے۔ کتاب کا انداز بیان بھی بہت دلکش ہے اور جا بجا نقوش و تصاویر سے اسے اور زیادہ دلچسپ بنا دیا گیا ہے۔ ہر وہ شخص جو مذاہب کی داہمہ پرستی اور ان کی جاہلانہ بنیاد سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے اس کتاب کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی۔

شرح درد

خواجہ میر درد کے دیوان کی شرح ہے جسے (دوسرے خواجہ) محمد شفیع دہلوی نے مرتب کیا ہے۔ درد اپنی شاعری کے لحاظ سے خاص امتیاز و مرتبہ کے مالک تھے اور ان کا دیوان باوجود بہت مختصر ہونے کے دوسرے شاعروں کے بڑے بڑے ضخیم دیوان سے زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ درد کا سوز و گداز اور صحیح رنگ و تغزل بہت کم کسی شاعر کو نصیب ہوا، چنانچہ جتنے اچھے اشعار ہم کو ان کے یہاں مل جاتے ہیں اتنے (کلام کی ضخامت کو پیش نظر رکھ کر) میر کے یہاں بھی نہیں ملتے۔ ہر چند کلام درد کسی شرح کا محتاج نہ تھا، لیکن خواجہ محمد شفیع دہلوی نے ان کی شاعری کے متصوفانہ پہلو کو ابھارنے کے لئے اسے ضروری سمجھا۔ بہر حال اس شرح سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن کلام درد کا ایک صحیح نسخہ ضرور ہاتھ آ جاتا ہے اور یہ بھی کم بات نہیں۔ قیمت ۸۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی۔

یاد رفتگان

خواجہ عبدالمجید صاحب ساکن مٹیا محل دہلی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے تقریباً دو درجن بڑے بڑے لوگوں سے متعلق صرف وہی واقعات تحریر کئے ہیں جو خود انھوں نے دیکھے تھے۔ یہ کتاب میر محبوب علی پاشا، شاہ دکن کے نام سے شروع ہوتی اور ابنار عبداللہ پر ختم ہوتی ہے۔ درمیان میں سرسید ڈبٹی نذیر احمد، شبلی، داغ، سرشار، حالی، شرر وغیرہ کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ کتاب مختصر ہے لیکن دلچسپ۔ قیمت ۱۲۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی۔

بت تراش

جناب اشتیاق حسین قریشی کا مختصر سا ڈرامہ ہے، جس میں انھوں نے ایک بت تراش کے اس خیال کو کہ کاش اس کے بنائے ہوئے مجسمے زندہ ہو جائیں، ایک خواب کی صورت میں پورا ہوتے دکھایا ہے۔ پلاٹ نہایت دلچسپ ہے۔ قیمت ۴۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی۔

کیا خوب آدمی تھا

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے ایک سلسلہ تقریروں کا شروع کیا تھا جس میں ابض اکابر کے حالات انھیں لوگوں سے لکھوائے گئے تھے جو ان کے حالات سے زیادہ واقف تھے۔ انھیں تقریروں کا مجموعہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اس نام سے شائع کیا ہے۔

اس مجموعہ میں جن اکابر کا ذکر کیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں: راشد النخیری، حالی، نذیر احمد، چلبست، داغ، پریم چند حکیم اجل خاں، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر اقبال، سر اس مسعود، مولانا محمد علی۔ کتاب کام کی ہے اور دلچسپ بھی۔ قیمت ۸۔

میر محمد مومن

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کی ۳۲ ویں کتاب ہے یہ تالیف ڈاکٹر زور کی ہے جو اس ادارہ کے

روح رواں ہیں۔ اس کتاب میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم میر محمد مومن کے حالات زندگی درج کئے گئے ہیں اور ان کے تمام علمی و سیاسی و وفاہی کارناموں کا تفصیل ذکر کیا گیا ہے، تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے اور ۳۱۲ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت ۱۰ روپے اور ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد - حیدر آباد دکن

ادبی تاثرات مجموعہ ہے ڈاکٹر زور کے چند انتقادی خیالات کا جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے انھیں "خیالات" صرف اس لئے کہا کہ ان میں وہ تفصیل نہیں پائی جاتی جو ایک مقالہ کے لئے ضروری ہے۔ شروع میں مرزا قدرت اللہ بیگ ام۔ اے کا لکھا ہوا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے ڈاکٹر زور کی انتقادی اہلیت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ قیمت ۱۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر - حیدر آباد دکن۔

انوار مجموعہ ہے جناب علی اختر صاحب اختر کی غزلوں کا جس میں بعض نظمیں اور رباعیاں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ علی اختر وہی ہیں جن کے کلام کا انتخاب جنوری سال ۱۹۷۷ء کے نگار میں شائع ہوا ہے۔

جناب علی اختر اپنی نظموں کی وجہ سے بہت مشہور ہیں، لیکن ہر اچھے شاعر کی طرح ان کے ذوق سخن کی ابتدا بھی غزلگوئی ہی سے ہوئی تھی۔ ان کے غزل کا رنگ عاشقانہ نہیں بلکہ عارفانہ ہے، اسی لئے ان کے کلام میں سوز و گداز کی جگہ غور و فکر کی جھلک زیادہ پائی جاتی ہے۔

وہ غزل کو اس وقت کے دوسرے نظم گو شعرا کی طرح غیر محدود چیز سمجھتے ہیں اور صرف حسن و عشق تک اسے محدود کرنا پسند نہیں کرتے۔ اگر اسے عدم اہلیت عشق پر محمول نہ کیا جائے تو بات بری نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس صورت میں غزل اور نظم کے درمیان خط امتیاز کیونکر قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس مجموعہ کی قیمت ۱۰ روپے اور ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر - حیدر آباد دکن۔

خطابیات شیخ رحیم الدین کمال ظہیر آبادی کا مختصر سا رسالہ ہے فن تقریر پر جس میں بعض اصولی باتوں کو بیان کر کے نمونے کی بعض تقریریں پیش کی گئی ہیں اور بعض مشہور مقررین کی خطابت پر اظہار خیال بھی کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ روپے۔ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر - حیدر آباد دکن۔

بلقان عام معلومات کے سلسلہ کی چیز ہے جسے ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد نے شائع کیا ہے۔ اس کے مولف جناب حفیظ صدیقی بی۔ اے۔ سی ہیں۔

اس رسالہ میں بلقان کی ریاستوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن بہت مختصر۔ مخاطب شاید طلبہ کی جماعت ہے۔ قیمت ۳ روپے۔ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر - حیدر آباد دکن۔

کتاب العلم لاہور کی "ایسٹرن پبلشنگ اینڈ ڈسٹری بیوٹرز" نے اردو کی "انسائیکلو پیڈیا" کا سلسلہ اس نام سے شروع کیا ہے اور اس کا پہلا حصہ ہمارے سامنے ہے۔

یہ اہم خدمت صرف دو حضرات محمد سعید بیگ صاحب اور محمد اسماعیل صاحب نعیم نے اپنے سر لی ہے اور اگر یہ کام انجام تک پہنچ جائے تو اس میں شک نہیں کہ اردو کی دنیا میں بالکل معجزہ قرار دیا جائے گا۔ ترتیب میں حروف تہجی کا

لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ فنون کے لحاظ سے تقسیم کی گئی ہے۔ ابھی تک کوئی صحیح اندازہ اس کا نہیں ہو سکا کہ یہ کتاب کتنے اجزاء پر مشتمل ہوگی اور اس کی یہ بے پایاں صرف اسی لئے ہے کہ ترتیب میں حروف تہجی کا لحاظ نہیں کیا گیا۔

جس حد تک ظاہری حسن کا تعلق ہے، یہ کتاب طباعت و کتابت اور نقوش و تصاویر کے لحاظ سے لیتھوگرافی کی دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتی، لیکن معنوی حسن کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

تصنیف ہے جناب غلام عباس سب اڈیٹر آواز کی، یہ کتاب بظاہر ایک فسانہ معلوم ہوتی ہے، لیکن **جزیرہ سخنوران** دراصل ایک طنزیہ انتقاد ہے ہمارے ان شعرا پر جنہوں نے شعر کا مفہوم صرف ضلع جگت سمجھ رکھا ہے

اس کتاب کا بنیادی خیال بقول مصنف ایک فرانسیسی اہل قلم ”آندرے موردا“ کی کسی تصنیف سے لیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ غلام عباس صاحب نہایت قابلیت و حسن کے ساتھ اس کو صرف کیا ہے۔ کتاب دیکھنے کے قابل ہے ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے۔ قیمت ۷۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: کتاب خانہ ہزار داستان - ۲۲ بازار لین - نئی دہلی۔

تیسرا مجموعہ ہے جناب محمود مورخ بی۔ اے کے افسانوں کا۔ ان کے ایک **زہری لکھی اور دوسرے افسانے** مجموعہ پر ستمبر کے نگار میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ جناب مورخ مشہور

جرنلسٹ ہیں اور باوجود انتہائی ناکامیوں کے انہوں نے صحافت کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہ فسانے ملک کے مشہور رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ قیمت ۷۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: گل فروش پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

جناب پنڈت دیس راج شرما ابر سیمابی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے کلام میں وہی **حدیث ناتمام** آرٹ نمایاں ہے جو ان کے استاد حضرت سیماب اکبر آبادی کے کلام میں پایا جاتا ہے اور کافی دلکش

ہے۔ قیمت ۱۲ روپے۔ ملنے کا پتہ: دفتر شاعر آگرہ

جناب سلام مچھلی شہری کی بعض نظموں کا مجموعہ ہے۔ سلام صاحب اپنے آپ کو ترقی پسند شاعروں میں کہتے **میرے نغمے** ہیں، گو ابھی تک مجھے یہی نہیں معلوم کہ ترقی پسند شاعر کس چیز کا نام ہے، سلام صاحب ذہین نوجوان ہیں

اور سخن گوئی کی اچھی اہلیت اپنے اندر رکھتے ہیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ ”ادب برائے حیات“ کے نظریہ کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ فن کی پابندیاں بھی انہیں ناگوار ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے بہت سے ذہین نوجوان صرف اس لئے تباہ

و برباد ہو جاتے ہیں کہ ان کی گمراہی پر انہیں ٹوکا نہیں جاتا۔

یہ مجموعہ اردو سوسائٹی - دفتر اضطراب بنارس سے مل سکتا ہے۔

ادبستان بنارس نے حفیظ جونپوری کے سوا سو شعروں کا انتخاب اس نام سے شائع **جواہرات حفیظ جونپوری** کیا ہے۔ جناب حفیظ مشہور خوشگو شاعر ہیں اور ضرورت تھی کہ ان کا پورا دیوان شائع

کر کے ملک کے سامنے پیش کیا جاتا۔

یہ انتخاب ۳۰ میں مل سکتا ہے۔

گورنمنٹ یو۔ پی کے محکمہ اطلاعات نے یہ کتاب بہت بر محل شائع کی ہے۔ اس میں بحری طاقت کے مسئلہ **بحری طاقت** پر تمام وہ معلومات جمع کر دی گئی ہیں جن کا جاننا جنگ کے زمانہ میں بہت ضروری ہے۔ یہ کتاب پندرہ

الواب میں منقسم ہے اور بحری قوت سے متعلق کوئی ضروری مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا ذکر اس میں نہ کیا گیا ہو۔ تصاویر و نقوش کے اضافہ سے کتاب کی افادیت اور زیادہ ہو گئی ہے۔ طباعت و کتابت بھی بہت نفیس ہے۔ یہ کتاب محکمہ اطلاعات یوپی گورنمنٹ سے لکھنؤ کے پتہ پر غالباً مفت مل سکتی ہے۔

شمیم کے شو شعروں جناب سید مظفر حسین صاحب شمیم کے شو شعروں کا مجموعہ ہے جسے سید جمیل الدین صاحب نے مرتب کیا ہے۔

شروع میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا تعارف ہے جو جناب شمیم کے کلام میں سچائی کا عنصر بہت زیادہ پاتے ہیں منتخب اشعار کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شمیم کا ذوق تغزل واقعی پاکیزہ ہے اور تاثر کی کسک سے ان کا کلام خالی نہیں۔ یہ مجموعہ ہم میں اجل پرس مہی سے مل سکتا ہے۔

سوز و کداز مجموعہ ہے جناب حافظ محمد ولایت اللہ صاحب ناگپورہی کے منظومات و غزلیات کا۔ آپ بی۔ اے (علیگ) ہیں، خان بہادر ہیں سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں اور سی۔ پی کے نیشن یافتہ ڈپٹی کمشنر۔ ظاہر ہے کہ ایسے باکار آدمی کو شاعری کے بیکار مشغلہ کے لئے فرصت کب مل سکتی تھی، پھر بھی آپ کے فطری ذوق نظم نگاری نے یہ مجموعہ مرتب کرا ہی دیا۔ اس میں قومی، اخلاقی، سیاسی، سنجیدہ و غیر سنجیدہ سبھی قسم کی نظمیں پائی جاتی ہیں۔

کتابت و طباعت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: محمد الطاف اللہ۔ چھاؤنی ناگپور

زندہ چین مجموعہ ہے چند چینی کہانیوں کا جنہیں جناب تمنائی نے اردو میں منقل کیا ہے۔ جس طرح جدید چین، قدیم چین سے بالکل مختلف ہے، اسی طرح وہاں کی جدید کہانیاں بھی قدیم داستانوں سے بالکل علیحدہ ہیں۔ چین کا موجودہ دور اک انقلابی دور ہے جس نے زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ وہاں کے ادب کو بھی بہت متاثر کیا ہے اور یہ کہانیاں اسی جدید ادبی تخلیق کی پیداوار ہیں۔ کہانیوں کا اسلوب بہت کچھ روسی کہانیوں سے ملتا جلتا ہے، لیکن پس منظر بالکل دوسرا ہے۔ اس مجموعہ میں سات مشہور افسانہ نگاروں کی کہانیاں درج ہیں، جنہیں دو چینی خاتونوں کا نام بھی نظر آتا ہے۔

جناب تمنائی کی یہ خدمت اردو ادب میں نہایت مفید و بر محل اضافہ ہے جس کی ہم کو قدر کرنا چاہئے۔ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ قیمت پچاس روپے۔ "نیا سنسار کتاب گھر بانگی پور" کے پتہ سے خط و کتابت کی جائے۔

ہماری زبان یہ پفلٹ بھی نیا سنسار کتاب گھر نے شائع کیا ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق صاحب نے بتایا ہے کہ اردو زبان کیا ہے اور اس میں ہر زمانہ کا ساتھ دینے کی کتنی اہمیت پائی جاتی ہے مولوی صاحب موصوف کی عمر ہی چونکہ اردو کی خدمت میں صرف ہوئی ہے، اس لئے انھوں نے اس مقالہ میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ماہرانہ حیثیت سے لکھا ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔ اس کی قیمت ۸ روپے۔

خط و کتابت میں

مینجر نگار

خریداری نہ ضرور لکھئے، جو ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیس طرٹ درج ہوتا ہے

وقت کی باتیں

عورت اور روس جب حکومت زار کے زمانہ میں (۱۸۵۷ء) مردم شماری ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہر دو عورتوں میں ایک عورت خادمہ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ باقی نصف میں سے کچھ کھیتی باڑی کام کرتی تھیں اور کچھ کارخانوں، ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں میں۔ اس کے بعد جب سوویت حکومت کا دور آیا تو ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۷ء تک اس سال کے زمانہ میں ۹۰ لاکھ عورتیں مفید کاموں میں لگ گئیں اور تیسری پنج سالہ اسکیم میں یہ تعداد دو گن کر تک پہنچنے والی ہے اور عورتوں کی خدمات بھی بہت زیادہ اہم ہوتی جا رہی ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ۴۰ فی صدی مزدوری پیشہ عورتیں بڑے بڑے تجارتی کارخانوں میں کام کرتی تھیں اور ۱۵ فی صدی دوکانوں میں۔ ۲۰ فی صدی ڈاکٹری اور تعلیمی پیشہ میں مصروف تھیں، ۲۳ فی صد صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں اور صرف دو فی صدی ایسی تھیں جو گھر کا کام کاج کرتی تھیں۔

سوویت حکومت میں بڑے بڑے صنعتی ادارے پائے جاتے ہیں اور ان سب میں عورتیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں، چنانچہ لینن گراڈ کے مشہور جو تانبہ لانے والے کارخانے (اسکروخود) کے ملازمین میں دو تہائی حصہ عورتوں کا ہے۔

اس خیال سے کہ عورتیں وہاں آزادی و اطمینان کے ساتھ پبلک لائف اور صنعت و حرفت میں حصہ لیکر ملک کی مدد کریں۔ حکومت نے بہت سے تربیت گاہیں اور تعلیمی ادارے قائم کر دیے ہیں، جہاں مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ کر کام پر چلی جاتی ہیں۔

پانچ سال پہلے ان تربیت گاہوں میں ۲۸ لاکھ بچے پرورش پاتے تھے اور اب اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ تعداد تقریباً ۵۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی، کیونکہ تیسری پنج سالہ اسکیم کی رو سے ان تربیت گاہوں کی تعداد بہت بڑھادی گئی ہے۔

جب فصلوں کے کٹنے کا وقت آتا ہے تو ہر سال زراعتی ادارے اپنی تربیت گاہیں علیحدہ قائم کر دیتے ہیں جہاں تقریباً ۶۰ لاکھ بچے پرورش پاتے رہتے ہیں اور ان کی مائیں اطمینان سے کھیتی باڑی کے کام میں لگی رہتی ہیں۔

مزدور عورتوں کے لئے آسانی پیدا کرنے کی غرض سے وہاں پکا پکایا کھانا فراہم کرنے والی دوکانیں کثرت سے کھولی گئی ہیں، چنانچہ ۱۹۳۹ء تک روس کے بڑے بڑے شہروں میں ۵۰ ہزار دوکانیں ایسی قائم ہو چکی تھیں، جن میں سالانہ ۱۳ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کا کاروبار ہوتا تھا۔ مردوں کی طرح روس کی عورت بھی سات گھنٹے روزانہ کام کرتی ہے، اور مردوں کے برابر سے اجرت ملتی ہے۔ وہاں اس بات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ہر عورت اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے اتنا ہی کام کرے جو اس کی صحت کو خراب کرنے والا نہ ہو، وہاں قانوناً اس کی ممانعت ہے کہ عورتوں کو ایسے کاموں میں لگایا جائے جو ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالنے والے ہیں۔ جن عورتوں کے بچے ۶ مہینے سے کم ہوتے ہیں، ان سے رات کو کام نہیں لیا جاتا۔

روس میں سب سے زیادہ انقلاب زراعتی طبقہ کی عورت میں ہوا ہے۔ وہاں پہلے بھی لاکھوں عورتیں اسی پیشہ میں مصروف نظر آتی تھیں لیکن ان کی حالت بقول گورکی ایک مظلوم و پامال غلاموں کی سی تھی۔ وہ صبح سے شام تک کام کرتی تھیں اور انہیں خبر نہ ہوتی تھی کہ اس محنت کا صلہ کیا ملا، لیکن آج روس کی زراعت پیشہ عورت کی حالت بالکل دوسری ہے۔

۱۹۳۶ء کے اعداد شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کے زراعتی اداروں میں ایک تہائی سے زیادہ کام عورتیں کرتی تھیں۔ اس سے قبل زار کے زمانہ میں سوائے کھربا اور نہسیا کے عورت کے ہاتھ میں کچھ نہ ہوتا تھا، لیکن آج وہ بڑی بڑی

زراعتی مشینوں کو خود چلا رہی ہے اور مرد کا آدھا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔

صنعت و حرفت وغیرہ میں بھی وہاں کی عورت نے نمایاں ترقی کی ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ روس کو چھوڑ کر اس وقت تمام دنیا میں دس ہزار عورتوں سے زیادہ انجینئری کا کام نہیں کرتیں، لیکن روس میں ایسی عورتیں دو لاکھ پانی بھاتی ہیں جو انجینئری اور مشینری کے کاموں میں مصروف ہیں۔ دیگر علوم و فنون میں یہ حال ہے کہ زار کے زمانہ میں وہاں صرف ۲۰۰۰ عورتیں ڈاکٹری کا پیشہ کرتی تھیں، لیکن اب یہ تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔

ورزش اور کھیل کود میں بھی وہ برابر مردوں کے دوش بردوش نظر آتی ہیں، چنانچہ اس وقت ہ لاکھ عورتیں وہاں لیبر اینڈ ڈیفنس (Labour Defence) کی نمبر ہیں اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار عورتیں وہ ہیں جو قدر اندازی کا ورزش شائق بیج اپنے بازو پر لگائے پھرتی ہیں۔

”روس اور برطانیہ کی فوجوں نے ایران میں داخل ہو کر اس ملک کو آجکل موضوع سخن بنا دیا ہے۔

اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس کی تاریخ پر اک نگاہ ڈال لی جائے۔“

موجودہ ایران

صرف ۱۹۲۵ء کی بات ہے جب سرزمین ایشیا کے اس حصہ نے جو فارس کے نام سے مشہور تھا، اپنا نام بدل کر ایران رکھا لیکن وہاں کے باشندوں کے نزدیک آریں آبادی کا مسکن ہونے کی وجہ سے یہ پہلے بھی ایران ہی تھا۔ ۱۸۰۰ سال مسیح سے پہلے جب وسط ایشیا سے آریں جماعت آگے بڑھی تو وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ مشرق کی طرف بڑھ کر ہندوستان آگیا اور دوسرا حصہ مغرب و جنوب مغرب کی طرف کوہستانوں کی طرف چلا گیا۔ یہ حصہ دوزبردست قوموں پر مشتمل تھا، میدی اور پارسی۔ ۶۰۰ء قبل مسیح میں میدیوں نے ایک بڑی سلطنت و جلہ کی مشرق میں قائم کر لی جو خلیج فارس سے بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی۔

ہیرودوٹس کا بیان ہے کہ یہ ایرانی سلطنت میدی قوم کے ایک فرد (Darius) نے قائم کی تھی اور مسیح سے ایک ہزار سال قبل بھی ان کا ایک مذہب تھا، لیکن بعد کو زردشت کے پیرو ہو گئے۔ دارا کے عہد میں اس سلطنت کو بڑا عروج حاصل تھا، مگر سکندر کے حملہ کے بعد اس کا زوال شروع ہو گیا۔ جب اسلام نے ظہور کیا تو یہ ملک مسلمان ہو گیا، کیونکہ عربوں نے چند سال کے اندر اس کو بالکل مغلوب کر لیا اور اس طرح ایران کی زردشتی فضا اسلامی فضا میں تبدیل ہو گئی۔

اٹھارھویں صدی کے اخیر میں قاچاری حکومت سے اس سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ اس وقت طہران مستقل طور پر پایہ تخت قرار دیا گیا اور ناصر الدین قاچار نے ہرات پر بھی قبضہ کرنا چاہا، لیکن انگلستان نے ۱۸۵۷ء میں خلیج فارس سے اپنی فوجیں اُتار کر بوشہر پر قبضہ کر لیا اور ناصر الدین کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اس کے بعد ایران کے باب میں برطانیہ اور روس کے درمیان رشک و رقابت شروع ہوئی، ان میں سے ہر ایک اپنا اثر جانا چاہتا تھا۔

۱۸۹۶ء میں ناصر الدین قاچار قتل کیا گیا اور اس کے بیٹے مظفر الدین نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی، لیکن ملک کی انتظامی حالت اس قدر خراب تھی کہ مجبوراً ۱۹۰۶ء میں اس نے پارلیمنٹری حکومت قائم کر دی۔ ۱۹۰۷ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے محمد علی شاہ نے پھر آئین حکومت کو بدلنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہوا اور اسے اپنے ہفت سالہ بیٹے احمد شاہ کے حق میں حکومت سے دستبردار ہونا پڑا، جس نے ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۵ء تک حکومت کی۔

مظفر الدین کے زمانہ میں روس کا اثر یہاں بہت قائم ہو گیا تھا لیکن اسی زمانہ میں (۱۸۵۷ء - ۱۸۵۸ء) روس کو جاپان کے مقابلہ میں سخت شکست اٹھانا پڑی اور اس طرح اس نے ایران کے باب میں برطانیہ سے مصالحت کر لی۔ اس معاہدہ کی رو سے (جو ۱۸۵۸ء میں ہوا تھا) دونوں کے حلقہ ہائے اثر متعین ہو گئے۔ یعنی شمالی ایران، روس کے زیر اثر رہا اور شرقی جنوبی حصہ میں خلیج فارس کے ساحلوں پر انگلستان کا اثر تسلیم کر لیا گیا۔

پچھلی لڑائی میں روس نے جرمنی اور ترکی کے خلاف جنگ کر کے ایران پر بھی قبضہ کر لیا تھا، لیکن انقلاب ہو جانے کی وجہ سے روسی فوجیں یہاں سے چلی گئیں اور اس طرح ۱۹۱۸ء تک سارے ایران پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ مگر اس کے دوسرے ہی سال یہاں انقلاب رونما ہوا اور برطانیہ کو یہ ملک چھوڑنا پڑا۔

اس وقت ملک کی حالت بہت نازک تھی اور ہر طرف انارکزم پھیلی ہوئی تھی کہ دفعتاً ایک شخص رضا خاں نمودار ہوا جو فوج کے معمولی عہدہ سے ترقی کر کے ۱۹۲۵ء میں یہاں کا فرمانروا ہو گیا۔

ایران رقبہ میں فرانس سے کمنا ہے۔ اور تین ہزار فٹ سے لیکر ۱۶ ہزار فٹ تک بلند پہاڑوں کا سلسلہ ملک کے شمال اور مغرب میں پھیلا ہوا ہے۔ میدانی علاقہ بھی نصف ریگستان ہے اور باقی نصف بھی اکثر بے آب و گیاہ ہے۔ عرب کی طرح یہاں کا حال بھی یہی ہے کہ خانہ بدوش جماعتیں چراگاہ کی فکر میں ادھر ادھر پھرتی رہتی ہیں اور جہاں سبزہ نظر آیا وہاں قیام کر لیتی ہیں۔ یہاں کی آبادی ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے جو سب کی سب آریں ہے اور زیادہ تر گاؤں میں رہتی ہیں۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے، لیکن عیسائی اور زرتشتی بھی یہاں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

یہاں کی معدنی پیداوار میں پٹرول خاص چیز ہے، اس لحاظ سے ایران دنیا کے پانچویں نمبر پر ہے اور ہزاروں ایرانی اس سلسلہ میں روزگار سے لگے ہوئے ہیں، یہاں کے پٹرولی چشمے ایک برطانوی کمپنی کے قبضہ میں ہیں جسکو شاہ ایران کی طرف سے خاص رعایتیں حاصل تھیں۔

ترکی کی طرح یہاں کی معاشرت میں بڑا انقلاب پیدا ہو گیا ہے اور انرجیت کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے یہاں عورتوں کو تعلیم سے بالکل محروم رکھا جاتا تھا، اور پردہ کی سخت پابندی تھی۔ لیکن اب پردہ بالکل اٹھ گیا ہے اور ان کو ممبر پارلیمنٹ بننے کا حق بھی دیدیا گیا ہے۔

رضا شاہ نے ایران کو تہذیب بنانے اور ترقی دینے میں بڑی کوشش کی اور اس میں شک نہیں کہ پٹرولی چشموں نے اس کے مستقبل کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ یہاں ۵۰ میل لمبی پائپ لائن بنی ہوئی ہے جس کے ذریعہ سے پٹرول خلیج فارس تک پہنچتا ہے۔ یہاں کی پٹرولی پیداوار کا اوسط ۷۰ لاکھ ٹن سالانہ ہے جس میں ۲۰ ہزار ایرانی کام سے لگے ہوئے ہیں جرمنی کے بادشاہوں کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ وہ اپنے اثرات ایران تک وسیع کر دیں، چنانچہ قونیہ سے خلیج فارس تک ریلوے بنانے کی اجازت ایک جرمن کمپنی کو مل ہی گئی تھی، لیکن پچھلے سال یہ اسلیم درہم برہم ہو گئی۔

ہٹلر کے عروج کے وقت سے نازیوں کی آمد و رفت یہاں اور عراق میں کثرت سے شروع ہو گئی تھی اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ایران کو مرکز بنا کر برطانیہ کے خلاف عراق اور ہندوستان میں کارروائی کریں، لیکن روس اور برطانیہ کی فوجوں نے یہاں پہنچ کر ہٹلر کی اس امید کو خاک میں ملا دیا۔

مغل لائن لمیٹڈ

حاجیوں کے جہازات

شاہی سمندری بیڑہ، شاہی ہندوستانی بیڑہ اور شاہی ہوائی فوج کی حفاظت میں سال گزشتہ کا حج بخیریت تمام ہو گیا تھا اور اب مغل لائن فخر کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ حکومت ہند کی رضا مندی اور مشورہ سے حاجیوں کے لئے جہازات کی روانگی کا انتظام ہو گیا ہے۔

چونکہ اس وقت لڑائی جاری ہے اس لئے اس وقت جہازوں کے نام اور ان کی روانگی کی صحیح صحیح تاریخیں نہیں بتائی جاسکتیں لیکن حج کو جانے والوں کو چاہئے کہ وہ ذیل کی تاریخوں میں مندرجہ ذیل بندرگاہوں پر پہنچ جائیں اور اسکا انتظام بھی کر لیں کہ انھیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا جو پانچ روز سے زیادہ نہیں ہوگا۔

ممبئی :- پہلا جہاز ۱۰ نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا۔ کراچی :- پہلا جہاز ۱۱ نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا۔

دوسرا جہاز ۱۱ نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا۔ دوسرا جہاز ۱۸ نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا۔

کلکتہ سے صرف ایک جہاز ۲۶ نومبر ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوگا۔

شرح کرایہ حسب ذیل ہے :-

ممبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ	کلکتہ سے جدہ (آمد و رفت)
فرسٹ کلاس	۱۶ روپیہ	۹۵ روپیہ
(مع کھانے کے)		
تختہ جہاز کا	۱۹۶ روپیہ	۲۲۵ روپے ۸ آنے
(تھرڈ کلاس)		

اس کے علاوہ ہر مسافر کو روانگی کے وقت بندرگاہ پر جہاز تک پہنچانے اور جدہ میں جہاز سے اتارنے کے لئے مزید (سے) دینا ہونگے مزید تفصیلات پتہ ذیل سے دریافت کیجئے :-

ٹرنز مورسین کمپنی لمیٹڈ نمبر ۱۶ بینک اسٹریٹ - ممبئی

نیاز فچوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات صہنی (یا)	مجموعہ استفسار جواب سہ جلد	جذبات بھاشا	فلاسفہ و تدبیر
شہوانیات اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز کہ مذہب عالم نے اسے رواج میں کتنی مرد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے قیمت تین روپیہ (۳۰۰) علاوہ محصول	ان تینوں جلدوں میں سلسلہ سے لیکر سلسلہ تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہو کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (۳۰۰) علاوہ محصول	جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت بارہ آنے (۱۲۰) علاوہ محصول	اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں :- ۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ و تدبیر کی روحوں کے ساتھ ۲۔ ادین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (۱۰۰) علاوہ محصول
شاعر کا انجام	فراست الید	مذاکرات نیاز	گہوارہ تمدن
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ قیمت دس آنے (۱۰۰) علاوہ محصول	مولفہ نیاز فچوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص ہآسانی ہمت کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (۱۰۰) علاوہ محصول	یعنے حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کروینا انہیں تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت بارہ آنے (۱۲۰) علاوہ محصول	یہ وہ معرکہ الار کا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت دو روپیہ (۲۰۰) علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

نگار کے خاص نمبر

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۳۶ء	جنوری ۱۹۳۶ء	جنوری ۱۹۳۵ء	جنوری ۱۹۳۲ء
ڈراما اصحاب کہف خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسلمانہ خلافت و امامت پر پنجواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشا پر داری کا نمونہ ہیں۔ صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۴ روپیہ علاوہ محصول	ہندی شاعری نمبر (ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعرا کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام) اردو میں ہندی شاعری پر اس سے زیادہ بہتر انتخاب اور معلومات کا ذخیرہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ صفحات ۱۶۸ قیمت ۱۶ روپیہ علاوہ محصول	اردو شاعری نمبر (اردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعرا پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام) یہ مجموعہ اردو شاعری پر اتنی معلومات رکھتا ہے کہ اس کے بعد کبھی تذکرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی متعدد مضامین اور دیگر نگار کے قلم کے ہیں صفحات ۲۳۶-۱ اس میں ادبی نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے قیمت چار روپیہ (لحد) علاوہ محصول	(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھ کر ان کی شوخی نگاری کو دکھایا گیا ہے۔ صفحات ۱۵۶ معہ تصویر غالب (رنگین) قیمت دو روپیہ (عام) علاوہ محصول
جنوری ۱۹۳۱ء	جنوری ۱۹۳۰ء	جنوری ۱۹۲۹ء	جنوری ۱۹۲۸ء
یہ نمبر دنیا کے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعرا نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزل گوئی پر بھی موجود دیکھنے کے قابل ہے قیمت دو روپیہ (عام) علاوہ محصول	نظریہ نمبر (اس کے بعض عنوانات یہ ہیں :- نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ - صفحات ۱۶۸ قیمت ایک روپیہ (عام) علاوہ محصول	مصحفی نمبر (اس کے بعض عنوانات یہ ہیں :- حیات مصحفی - اردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں - انتخاب کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ - صفحات ۱۶۳ قیمت ایک روپیہ (عام) علاوہ محصول	تاریخ اسلامی ہند - یہ تاریخ جس وقت نثر اور کاوش و تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہو گا جغرافی و و اقامتی تحقیق اسل مانندوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲ قیمت دو روپیہ (عام) علاوہ محصول

مطبوعہ انجمن اسلامیہ پاکستان (پیشہ ورانہ شہر: ایس ایس سٹریٹ)